دلّی جو ایک شہر تھا

دلّی جو ایک شہر تھا

راجندر لال ھانڈا

مترجم

سلیم احمد ایم۔ اے

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار۔ دہلی ۶

★

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ۔ علیگڈھ

پہلی بار :- ۳۰۰۰

قیمت :- 6/-

جون ۱۹۶۹ء

POPULAR PRESS DELHI.

انتساب

۱۹۴۷ء کے ان یادگار لمحوں کے نام جو میں نے محترم
فیاض حسین کے ساتھ گذارے

راجندر لال ہانڈا

۱۷ر جون ۱۹۶۹ء

ترتیب

تمہید ـــــ نقشِ اوّل

پچھلے دس برس (۱۹۴۰ ـــــ ۱۹۵۰) ہمیشہ غیر معمولی طور پر دنیا کی تاریخ میں اہم رہیں گے۔ ان دس سالوں میں دنیا کی بساط ہی پلٹ گئی۔ زندگی کا اسٹیج ہی بدل گیا۔ نہ وہ ڈرامہ رہا۔ نہ وہ اداکار۔ ایک ایک کر کے سب کلاکار پردے کے پیچھے چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ پر نئے کردار نئے ڈرامہ نئے کہانی کار اور بہت سے نئے سامعین آ گئے ہیں۔

اس ڈرامہ میں ہمارے ملک کی راجدھانی دلّی کا بھی خصوصی مقام ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ جنگ کے زمانہ میں برما اور جنوب مشرقی ایشیا میں لڑائیاں دلّی سے بیٹھ کر لڑی جا رہی تھیں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اس مدت میں دلّی ایک سامراجی نظام کے مرکز سے بدل کر ایک عظیم آزاد قوم کی راجدھانی بن گئی ہے۔ جو ناقابلِ تصوّر تبدیلیاں دنیا میں ہوئیں ان کے اثرات ہمارے دیش پر بھی پڑے اور جو تبدیلیاں ہمارے دیش میں ہوئیں ان کے سب سے گہرے نقوش دلّی پر پڑے ہیں۔

دلّی دوسرے معمولی شہروں جیسی بستی نہیں ہے۔ ایک معمولی شہر اور دلّی میں وہی فرق ہے جو ایک مٹی کے ڈھیلے اور ایک پرانی صراحی میں ہوتا ہے۔ صراحی بھی بنی مٹی کی ہے۔ پر اس پر

بہت سے ہاتھوں کے نشانات ہوتے ہیں۔ صراحی کمہار کے ہی فن کا کمال نہیں اس کی اپنی بھی ایک زندگی ہے۔ اس سے نہ جانے کتنے پیاسوں نے فائدہ اٹھایا ہو۔ ممکن ہے منچلے نوجوانوں نے اس میں شراب بھر کر پی ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مہینوں وہ بیکار پڑی رہی ہو۔ اندر پانی کی بوند نہیں اور اوپر کائی اور دھول کی تہہ جمی ہو۔ ایسی صراحی اور مٹی کے ڈھیلے کا کیا موازنہ۔

ٹھیک یہی فرق دلّی اور دوسرے شہروں میں ہے۔ صدیوں سے ہی نہیں بلکہ تاریخ کی ابتدا سے ہی دلّی کی کچھ خصوصیات رہی ہیں۔ تاریخ کا طالب علم جب کبھی آنکھیں بند کر کے ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہے تو دلّی اسے ایک بلند اور عظیم مینارہ کے مانند دکھائی دیتی ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ ہزاروں برس ہوتے جب آریا لوگ اس ملک میں آئے اور شمال مغربی علاقہ میں آباد ہو گئے تھے۔ جسے وہ سپت سندھو کہتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد وہ دکن کی طرف بڑھے۔ اور جیسے ہی جمنا کے ساحل پر آریوں کا قافلہ پہونچا۔ رشی اگستیا کو شک کے کسی رشتہ دار نے رکنے کا حکم دیا ہو گا۔ اس حکم میں ہی شاید دلّی کی پیدائش کا راز چھپا ہے۔ اس وقت سے آج تک دلّی کے پردہ پر بہت سی تصویریں بنیں۔ بہت سی تحریروں کے نقوش ابھرے۔ ان میں سے کچھ تو بالکل مٹ گئے۔ کچھ دھندلے پڑ گئے۔ اور کچھ آج بھی صاف دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان دس سالوں میں دلّی پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ بہت گہرے اور دیرپا ہیں۔ ان نقوش کے رنگ ابھی گیلے ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے ہر دیکھنے والا انہیں ٹھیک نہ سمجھ پاتا ہو۔ پر یہ سبھی جانتے ہیں کہ ان نقوش کے سامنے پرانے سبھی نقوش مدھم پڑ جائیں گے۔ کیونکہ یہ نقوش اس قدر زیادہ اور اتنے گہرے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے تاریخ کی دوسری بنیادی باتوں کو کوئی خوردبین سے پڑھ سکے تو پڑھ سکے۔

دلّی کا یہ بیان کوئی کہانی یا افسانہ نہیں۔ اس لئے یہ مناسب ہو گا کہ ہم تصویروں کی بحث سے نکل کر گوشت پوست کے انسانوں کی باتیں کریں۔ آخر دلّی میں جو تبدیلیاں حال میں ہوئی ہیں۔

ان کا خاص موضوع تو انسان ہی ہے۔ سیپیوں کا سمندر سے جو تعلق ہے وہی انسانوں کا ان واقعات سے ہے۔

ان دس سالوں میں دلّی کی آبادی میں زبردست تبدیلی ہوئی ہے۔ یہ تبدیلی صرف اعداد و شمار ہی کے اعتبار سے بڑی نہیں بلکہ ایک خاص خوبی کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ ہزاروں۔ ممکن ہے لاکھوں کی تعداد میں یہاں کے قدیم رہنے والے باہر چلے گئے اور لاکھوں باہر کے لوگ یہاں آ بسے ہیں۔ دلّی ایک مخصوص زبان اور ایک عجیب و غریب تہذیب کی علامت تھی۔ وہ زبان اور تہذیب اب غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کا وہی حال ہوا ہے جو سیلاب کے وقت چھوٹے چھوٹے پلوں کا ہوا کرتا ہے۔

جب رہنے والے بدلے تو رہن سہن اور طرز زندگی کا بدلنا بھی لازمی ہی تھا۔ اگر کوئی ایسا شخص جو پندرہ سال سے غیر ملک میں رہ رہا ہو اور اس سے پہلے کی دلّی سے واقف ہو اگر آج راجدھانی میں آئے تو اس کی حالت "رپوین وِکل" کی سی ہوگی۔ گلی کوچوں اور عمارتوں کو پہچانتا ہوا بھی وہ چاروں طرف نئے پن کے ہی دیدار کرے گا۔ گلی کوچے بھی شاید اسے بدلے ہوئے دکھائی دیں۔ لال قلعہ جامع مسجد وغیرہ جیسی تاریخی عمارتیں ہی اسے شک میں پڑنے سے بچا سکیں گی۔

جہاں تک طرز زندگی کا تعلق ہے۔ اس میں تبدیلی کے تناسب کو ناپنے کے لئے غیر ملکی سفر کی بھی ضرورت نہیں۔ جو لوگ سالوں سے یہیں رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کی طرف ان کا دھیان ایسے جاتا ہے۔ جیسے ٹھوکر لگ کر گرنے والے کا سڑک کی طرف۔ دلّی کسی وقت اپنے حلوہ والوں۔ پراٹھے والوں۔ سلمہ ستارہ والوں۔ چاٹ والوں اور تانگہ والوں کی وجہ سے مشہور تھی۔ آج دلّی میں چاہے سب کچھ ہو پر یہ لوگ دکھائی نہیں دیتے۔ ان میں سے اب بھی بہتیرے یہیں ہوں گے۔ پر ان سے ملنے کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے وہ یہاں ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ حلوائیوں میں اب اکثریت باہر

آئے ہوئے لوگوں کی ہے۔ اس لئے سوہن حلوہ کی جگہ اب سندھی حلوہ ہی زیادہ بکتا ہے۔

پراٹھے والوں کا بیوپار بھی اب مندہ پڑ گیا ہے۔ کیونکہ ایک پراٹھے کی جگہ اب چار شامی کباب اور گوشت روٹی والے ہیں۔ اور چاٹ والوں کو چھولے کلچے والے ہاتھ کر کے لے گئے۔ سلمہ ستارہ اور گوٹہ کناری کا اب ویسے ہی رواج نہیں رہا۔ فیشن کا تو سماج سے گہرہ تعلق ہے۔ جیسے جیسے سماج بدلتا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی فیشن بھی بدلتے ہیں۔ اب رہے تانگے والے۔ کم از کم اسی فیصد تانگے والے دلی سے چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ نئے آدمی یہ کام کرنے لگے ہیں۔ ان میں اُن جدی تانگے والوں کی بات کہاں جو گھوڑے سے ایک خاص لہجہ میں باتیں کیا کرتے تھے۔ جو ہر صاف ستھرے لباس والے کو حضور اور غریب کو گنوار کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ اور جو خالی وقت میں سواریوں کی راہ دیکھتے تانگہ پر بیٹھے پتنگ اڑایا کرتے تھے۔

خیر کون گیا کون آیا کیا بدلا اور کیا رہا؟ اس کا تفصیلی حال اس کتاب میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دلی کی زندگی میں ہونے والے ان واقعات کی اہمیت اس لئے ہے کہ دلی پہلے کی طرح آج بھی ہندوستان کا سیاسی مرکز ہے۔ علم ریاضی یا جغرافیہ نے بھلے ہی دلی پر حملہ کیا ہو اور جو مقام پہلے ہی دیش کے ٹھیک وسط سے دور تھا اب سمٹ کر چاہے حدود میں آگیا ہو۔ پرانتظامیہ سیاست اور طرز فکر کے نقطہ نظر سے دلی اتنا متاثر کن مرکز شاید ہی پہلے کبھی رہا ہو جتنا آج ہے۔ اس لئے دلی کی تبدیلیوں میں پورے ملک کی تبدیلیوں کا عکس نظر آتا ہے۔ دلی کے پچھلے واقعات کے مطالعہ سے آزاد ہندوستان کی سیاست اور سماجی رفتار پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

ان دس سالوں میں گردش ایام کا پہیہ بڑی تیزی سے گھوما ہے۔ جنگ عظیم کا شروع ہونا۔ لوگوں کی سادہ اور آسان زندگی۔ ۱۹۴۲ء کا انقلاب۔ آزادی سے متعلق گفت و شنید۔ آزادی کی آمد۔ ملک کی تقسیم ۱۹۴۷ء کے فسادات۔ لاکھوں شرنارتھیوں کا آنا۔ اور ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کا ہجرت کر جانا۔ گاندھی جی کا قتل۔ شرنارتھیوں کا مسئلہ۔ مسلسل بڑھتی مہنگائی وغیرہ یہ ہیں اس دور کے خاص

حادثے۔

ایک تو خود یہ حادثے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ پھر یہ ہندوستان کی راجدھانی میں واقع ہوئے۔ اس لئے ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح سے ہندوستان کی پچھلی دس سال کی تاریخ دلّی کے اس دس سال کے دور سے اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے دلّی کے رہنے والے اس خیال سے اتفاق نہ کریں۔ اگر یہ صحیح ہے اس میں قصور ان حادثات کا نہیں ہماری آنکھوں کا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ انسانی مزاج کا قصور ہے۔ قریب سے دیکھنے والا ہمیشہ فائدہ میں نہیں رہتا۔ کچھ چیزوں کو ان کی اہمیت کے مطابق دور سے ہی دیکھا جائے تو ان کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے ان حادثات کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کے بارے میں بہت قریب سے سنا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کچھ لوگ ان کو غیر معمولی نہ مانتے ہوں۔ اس اصول پر یقین کرتے ہوئے میرا خیال ہے کہ آنے والا مورخ ہی ان حادثات و واقعات کی اصل اہمیت کو صحیح طور پر سمجھ پائے گا۔

راجندر لال ھانڈا

نئی دلّی

۱۵ر جنوری ۱۹۵۱ء

تمہید ـــــ نقش دوئم

"دلّی میں دس برس" کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ادھر دس بارہ سالوں سے یہ کمیاب ہے۔ دوسرا اڈیشن شائع کرنے کا مطلب صرف کتاب کو فراہم کرنا ہی نہیں حالات کی کچھ ایسی مجبوریاں بھی ہیں جن کا جواب اسے دوبارہ شائع کرنے کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

پہلی بار چھپنے کے بعد اگر "دلّی میں دس برس" کی بہت تعریف ہوئی تو ساتھ ہی اس کی بہت بے قدری بھی ہوئی۔ ایک کا سبب قارئین کی دلچسپی تھا اور دوسری کی وجہ پبلشر کی مہربانی وہ بیچارہ دلّی کے پھیر میں آگیا۔ اور اسے دکان بڑھانی پڑی۔ اس وجہ سے دوسری کتابوں کے ساتھ "دلّی میں دس برس" بھی بازار میں تل کر آلو کے بھاؤ بکی۔ پر اس سے کسی کو شکایت کیا۔ خوشی کی بات ہے کہ کتاب نے بھی وہی اتار چڑھاؤ دیکھے جن کے لئے دلّی بدنام یا مشہور رہی ہے۔

ایک وقت تھا جب پاکستان سے آئے سب لوگوں کو پناہ گزیں کہتے تھے اب حالات اتنے بدل گئے ہیں خود آدھی دلّی ان کی پناہ میں آگئی ہے۔ یہاں انہوں نے اتنی بستیاں بسائیں اور اتنے مکان بنائے کہ ان کی پناہ میں آئے بنا آج دلّی میں سب کے لئے سر چھپانا مشکل ہو گیا ہے۔

اس رفتار کو دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ "دلّی میں دس برس" کو پھر سے چھاپا جائے۔ مواد۔ کہانی اور کہانی کار رنگ بھنگ وہی ہیں لیکن تصویر کا رنگ بدل گیا ہے۔ اس سے تصویر کا چمک اٹھنا لازمی ہے۔ کتاب تقریباً وہی ہے پر اسے پڑھنے سے ۱۹۵۱ء میں جو لطف آیا ہوگا اب ۶۷-۱۹۶۶ء میں یقیناً اس میں تبدیل شدہ چاشنی کی مہک ملے گی۔

کتاب کی بات چھوڑ کر کچھ آپ بیتی کے بارے میں بھی کہنا بے موقع نہ ہوگا۔ کتاب چھپی اور ہندی۔ انگریزی۔ بنگالی۔ گجراتی وغیرہ زبانوں کے اخباروں میں اس پر اچھے تبصرے ہوئے یہاں تک کہ کتاب کے کچھ حصے گجرات ودیاپیٹھ اور دوسرے تعلیمی اداروں نے کورس کی کتابوں میں بھی شامل کئے۔ جہاں ایک طرف یہ اہتمام ہوا وہاں دوسری طرف لکھنے والے کے سمن بھی جاری ہوگئے۔ کچھ تنگ نظر قارئین کو "دلّی میں دس برس" سے ملک اور قوم کے ساتھ غداری کی بو آئی۔ شاید انہیں کے اثر سے مصنف کو اس کے دفتر سے نوٹس مل گیا۔ اور یہ سول سرکاری قاعدے توڑنے کے الزام میں اس سے جواب طلب کیا گیا۔ مہینوں کی لکھا پڑھی اور بات چیت کے بعد کسی طرح سانپ مرا اور لاٹھی بھی بچ گئی۔ اس واقعہ نے مصنف کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ لیکن تجربہ برا نہیں۔

بس ایک بات اور کہوں گا۔ ۱۹۵۴ء میں مجھے ایک مشاعرہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میر درد روڈ (نئی دلّی) پر ایک اردو پریمی شخص نے چھوٹی سی محفل کا اہتمام کیا تھا۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ اور نہ مجھے ان کی طرف سے دعوت نامہ ہی ملا تھا۔ میں ویسے ہی ایک دوست کے ساتھ وہاں چلا گیا۔

ایک تو جگہ کا نام میر درد روڈ۔ دوسرے محفل اردو کی تھی اور تیسرے مدعو لوگوں میں پاکستان سے آئے شاعر بھی تھے آپ ہی آپ سب کی نظر دلّی پر پڑی اور نظم کا موضوع "دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب" ہو گیا۔ دلّی کی رنگینیوں کا ذکر کرتے جب ایک شخص نے "دلّی میں دس برس" کا ذکر کیا تو میں چونکا۔ پتہ لگا کہ کتاب پہ تبصرہ کچھ اردو اخباروں میں بھی ہوا تھا۔

میرا یقین ہے کہ دلی کے رہنے والے یا اس شہر سے کسی طرح کا بھی تعلق رکھنے والے لوگ "دلی میں دس برس" کا اگر خیر مقدم نہیں تو کم سے کم مخالفت بھی نہیں کریں گے۔ اس بارے میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ دلی اپنے چاہنے والوں کو خوب جانتی ہے۔ اور اسے ان پر پورا بھروسہ ہے۔

دلی کبھی تعریف کی محتاج نہیں رہی۔ تھوڑی سی یہ خوبی "دلی میں دس برس" میں بھی اتفاق سے آگئی ہے۔

راجندر لال ھانڈا
نئی دلی

۲۰ مارچ ۱۹۶۶ء

●●

پیش لفظ

از پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر
جامعہ ملیہ اسلامیہ

چند سال ہوئے میں نے لندن شہر کی ایک تاریخ پڑھی تھی، معلوم ہوا کہ یہ صرف بستی نہیں ہے، بلکہ ایک شخصیت ہے، جس نے رفتہ رفتہ نشو ونما پائی ہے، اور دنیا میں ممتاز ہونے کے باوجود اس نے اپنی خصوصیات کو باقی رکھا ہے۔ ایسی تاریخ یورپ کے بیشتر پرانے شہروں کی بھی لکھی جا سکتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ان شہروں کو شاہی سندوں کے ذریعے قانونی شخصیت حاصل ہوئی تھی۔ یہ بادشاہوں سے اجتماعی حیثیت سے معاملے کر سکتے تھے، بادشاہ کو مالی امداد دینے کے بدلے حقوق حاصل کر سکتے تھے، اپنی حفاظت کے لئے چھوٹی موٹی فوجیں رکھ سکتے تھے، بلکہ اٹلی میں تو بعض شہروں نے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنے آپ کو شہری ریاستوں کی شکل دیدی تھی۔ یہ شہر اپنی صنعتوں اور اپنی تجارت کی بدولت دولت مند ہوئے تھے، انھیں اپنی دولت کو بڑھانے کا بہت خیال تھا اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی سڑکیں عمارتیں اور تفریح کے انتظامات ایسے ہوں کہ جن کی دور

دور تک شہرت ہو۔

ہندوستان میں شہروں کی حیثیت کچھ اور تھی۔ شاید ایک زمانہ تھا کہ جب شہر کے سیٹھ (شریشٹھی) اپنی اجتماعی حیثیت تسلیم کرانے میں کامیاب ہوئے تھے، لیکن گپت سلطنت کے زوال کے بعد کسی شہر کی یہ حیثیت نہیں رہی۔ مسلمانوں کے زمانے میں بڑے بڑے شہر تھے، لیکن ان کا دارو مدار شاہی دربار یا صوبائی حکومت یا مقامی حکومت کے مرکز کی حیثیت سے تھا، اس لئے کہ بادشاہ اور امرا سب سے بڑے مال کے خریدار تھے، اور انھیں کی سرپرستی صنعت اور تجارت کو فروغ دے سکتی تھی۔ شہروں کی ترقی میں بڑی رکاوٹ اس وجہ سے بھی ہوئی کہ ترکوں اور مغلوں نے اپنی خانہ بدوشی کی روایات کو نہیں چھوڑا، شامیانے اور شاندار خیمے، جن میں آرام اور آسائش کے تمام انتظامات تھے، پختہ عمارتوں کا مقابلہ کرتے رہے اور اس وجہ سے فائدے میں رہے کہ مکان اپنی جگہ سے ہٹائے نہیں جا سکتے، مگر شامیانے اور خیمے ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لگائے جا سکتے ہیں، پھر بھی بڑے بڑے شہر آباد ہوئے اور ہر شہر کی اپنی خصوصیات تھیں، جو دوسرے شہروں میں کم پائی جاتی تھیں۔ دہلی میں کئی شہر بنے اور اجڑے، شاہ جہاں آباد کو اس وجہ سے مستقل حیثیت حاصل ہو گئی کہ اس کی تعمیر کے پچاس ساٹھ سال کے بعد سے مغل سلطنت کا زوال شروع ہو گیا اور بادشاہ، سلطنت کا مسلسل دورہ کرنے کے بجائے ایک جگہ مقیم ہو گئے۔ دہلی کی زندگی کا ایک خاصا مکمل نقشہ "مرقع دہلی" میں ملتا ہے، لیکن یہ مرقع دہلی کے کسی رہنے والے نے نہیں بلکہ حیدر آباد سے آئے ہوئے ایک سیاستداں نے لکھا تھا، اس کے بعد دہلی والوں نے اپنے شہر کا حق اس طرح ادا نہیں کیا جس طرح کے چاہئے، اور ۱۸۵۷ء، ۱۸۵۸ء میں دہلی پر جو آفت آئی، اس نے دلّی کی پرانی زندگی کا نقشہ بگاڑ بھی دیا۔

ہانڈا صاحب کی یہ تصنیف بہت قابل قدر ہے، اس لیے کہ اس میں اس شہر کی

زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور کتاب کے پڑھنے والوں کو پرانی اور نئی دہلی سے ایسا لگاؤ ہو جائیگا، جو دلی شہر بہت بڑھ گیا ہے اور اس کے بوڑی گھومنے پھرنے، ملاقاتیں اور سیر و تفریح سے نہیں پیدا ہوتا۔ دہلی شہر بہت بڑھ گیا ہے اور اس کے رہنے والوں میں اب شاید بیشتر ایسے ہیں، جو دوسرے شہروں سے آئے ہیں، لیکن ان نو آباد لوگوں کی بھی ایک دو پشتیں گذر گئی ہیں، اب یہ دہلی والے ہو گئے ہیں اور یہ ہانڈا صاحب کی دہلی کو اب اپنا لیں گے۔ کتاب کے انداز بیان میں بھی ایسی کشش ہے جو شہر اور شہر والوں کو ایک جسم اور ایک جان کرنے میں مدد دے گا۔

محمد مجیب
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
۲۹ رمئی ۱۹۶۹ء

تعارف

راجندر لال ہانڈا ـــــ فن و فنکار

جناب غلام ربانی تاباں

راجندر لال ہانڈا بنیادی اعتبار سے ایک صحافی اور ادیب ہیں۔ اس کو محض ایک اتفاق ہی کہا جائے گا کہ وہ ایک سرکاری افسر بھی ہیں۔ اس لئے ان کی سرکاری ملازمت کو ثانوی درجہ کی چیز سمجھنا چاہیئے۔ ایک حد تک یہ بات درست ہے کہ سرکاری ملازمت اور تصنیف و تالیف دو متضاد باتیں ہیں۔ اگرچہ بہت سے سرکاری ملازمین اچھے قلم کار بھی ہوئے ہیں اور انہوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے سرکاری ملازمت کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی بھی کہا ہے اور ہمیشہ اس سے بیزار و نالاں رہے ہیں۔ ہانڈا صاحب یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی رائے میں سرکاری دفتروں کا ماحول تخلیق ادب کے لئے ذہن کو تیار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں ادبی ذوق۔ لکھنے لکھانے کا جذبہ اور ان کا صحافیانہ جوش بہت زیادہ شدید ہیں۔ ان کے اندر کا ادیب اسقدر توانا و طاقتور ہے کہ اس نے دفتری ماحول کو اپنے پر حاوی کرنے کی بجائے خود اس پر فتح حاصل کر لی ہے اور اس کو بھی اپنی ادبی و صحافتی فکر کا ایک جز بنا لیا ہے۔ فائلوں کی بے روح دنیا

ہر بھی انھوں نے اپنے فکر کی جولانی اور تخیّل کی تابانی کو مرنے نہیں دیا ہے۔ان کی صلاحیتیں زنگ آلود نہیں ہو سکی ہیں۔ ان کی دوسری ادبی و علمی خصوصیات سے قطع نظر بذات خود بانڈا صاحب کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ایسا کارنامہ جو کسی معمولی ذہن کے انسان کے بس کی بات نہیں۔ ایک جینئس ہی یہ کارنامہ انجام دینے کا اہل ہو سکتا ہے۔

اگر بانڈا صاحب کی مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی متعدد کتابوں کا سرسری جائزہ لیا جائے تو اس بیان کی صداقت کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ انھوں نے چھ کتابیں ہندی میں لکھی ہیں۔ ان میں سے چند ان کی کہانیوں کا مجموعہ ہیں۔ باقی سماجی و تہذیبی مضامین پر مشتمل ہیں۔ تین کتابیں انگریزی زبان میں ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب ان کی "ڈائری کے اوراق" ہے۔ دوسری کتاب کا نام "ریاستوں میں تحریک آزادی (Freedom Struggle in Princely States) تیسری کتاب ہے "وفاقی اکائیوں کی تہذیبی تقسیم نو" — (Cultural Redistribution of Federal Units) ان کے علاوہ زیر ترتیب کتابوں میں ایک کتاب قومی یکجہتی پر ہے۔ ایک دوسری کتاب جس کا مسوّدہ تیار ہو چکا ہے وہ ہے (Group Migration in Indian History) اپنی ہندی کہانیوں کا ایک انتخاب وہ انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ جو جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔

مگر بانڈا صاحب کو ادبی و علمی میدان میں ابھی بہت کام کرنا باقی ہے۔ ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں نہ معلوم ابھی کتنی کتابوں کے مسوّدے محفوظ ہیں جو صفحۂ قرطاس پر آنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے ذہن میں افکار و خیالات کی ایک حسین و دلفریب محفل آراستہ ہے۔ اس محفل کو انھوں نے سخت و گہرے مطالعہ اور زندگی کے گوناگوں تجربات سے گذرنے کے بعد سجایا ہے۔ ان کی دلچسپی کے موضوعات اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے

کرار کے علمی وادبی ذوق کا میدان کستد. روسیع ہے۔ اوران کا ذوق جستجو انھیں علم وفن کے موتیوں کی تلاش کے لئے کن کن گوناں گوں وادیوں میں لئے پھرتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پانڈے صاحب ہندی۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ بنگالی۔ گجراتی ۔مراٹھی۔فارسی اور فرانسیسی زبانوں پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ وہ لسانیات کے ماہر ہیں۔ ہندوستان کے لسانی مسئلہ میں ان کی اپنی ایک رائے ہے۔ یہ صرف رائے نہیں بلکہ ایک عقیدہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے لسانی جھگڑے کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے کہ تمام ہندوستانی زبانوں کو رومن رسم الخط میں لکھا جائے۔ اپنے اس نظریہ پر وہ نہایت سچائی اور ایمانداری سے یقین رکھتے ہیں۔ ایسا یقین کرنے کے لئے ان کے پاس مضبوط دلائل ہیں۔ انھوں نے اس موضوع کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔" زبان ایک دشوار مسئلہ" کے نام سے اس کتاب میں پانڈے صاحب کا ایک مضمون شامل ہے۔ جو اس مسئلہ پر نئے اور منصفانہ طرز فکر کا ترجمان ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اخلاقی جرأت سے کام لے کر چند ایسی باتیں کہہ ڈالی ہیں۔ جنکو آجتک کوئی نہیں کہہ سکا ہے۔ یہ مضمون زبان کے مسئلہ کا ایک بے باک تجزیہ اور منصفانہ حل ہے۔

پانڈے صاحب کی زندگی کا ایک دوسرا قابل قدر مشن قومی یکجہتی ہے۔ وہ اس ملک کے رہنے والے مختلف مذاہب کے ماننے والوں مختلف زبانیں بولنے والوں۔ اور مختلف علاقوں میں رہنے والوں کو ایک ہم آہنگ اور مضبوط قوم دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مشن ایک حسین خواب کی طرح ان کے دل ودماغ پر چھایا ہوا ہے۔ وہ اپنی زبان وقلم کے ذریعہ جب جب انہیں موقع ملتا ہے اپنے نظریات کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں بہت سے مضامین اس موضوع پر ان کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ خود ان کی ذاتی زندگی رواداری۔ وسعت نظری۔ بے لوث خدمت اور بنی نوع انسان سے سچی محبت کا ایک حسین مجسمہ ہے۔ زندگی کی بے شمار اعلیٰ قدروں نے

ان میں اپنا نشیمن بنالیا ہے ۔ ان کی ذات قومی یکجہتی کا ایک چلتا پھرتا پیغام ہے ۔ ان کی شخصیت ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کا سنگم ہے مگران کا دل اس سے بھی زیادہ کچھ کرنے کے لئے تڑپتا ہے ۔ وہ سماجی و تہذیبی سطح پر قومی ایکتا کے لئے کوئی ٹھوس اور تعمیری کام کرنا چاہتے ہیں ۔ انہیں مناسب وقت کا انتظار ہے ۔ جب بھی انھیں موقع ملے گا وہ اس میدان میں کود پڑیں گے ۔

اس موقع پر بے جا نہ ہوگا اگر چند جملے اس کتاب کے مصنف کی زندگی کے بارے میں بھی لکھ دیئے جائیں ۔ راجندر لال ہانڈا ضلع انبالہ میں فروری ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے ۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم انبالہ میں حاصل کی اور پھر بعد میں الہ آباد یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم ۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے اپنی تعلیم مکمل کی ۔ ٹریبون (لاہور) کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہو کر انھوں نے اپنی صحافیانہ زندگی کا آغاز کیا ۔ سات سال تک اس اخبار سے وابستہ رہنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں مرکزی حکومت کے پریس انفورمیشن بیورو میں آ گئے ۔ صحافت کو پیشہ کی حیثیت سے اختیار کرنے کے بعد ہی انھوں نے ملک کے مختلف مسائل پر مضامین لکھنے شروع کر دیئے تھے ۔ ان کے بیشتر مضامین مہاتما گاندھی کے اخبار ” ہریجن “ میں شائع ہوئے تھے ۔ گاندھی جی نے اپنے ایک خط میں ہانڈا صاحب کے طرز نگارش کی بھی تعریف کی تھی ۔ سرکاری ملازم کی حیثیت سے ہانڈا صاحب مختلف شعبوں اور وزارتوں سے وابستہ رہے ہیں ۔ گیارہ سال تک انھوں نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد کے پریس سکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے ہیں ۔ وزارت زراعت میں مشیر اطلاعات کے عہدہ پر فائز رہے ۔ اس کے بعد وزارت داخلہ میں لسانی مشیر کے فرائض انجام دیئے ۔ پھر وہاں سے وزارت دفاع میں ڈائرکٹر آف پبلک ریلیشن کی حیثیت سے ذمہ داریوں کو سنبھالا ۔ اب تک وہ وزارت اطلاعات و نشریات میں سینئر ڈپٹی ڈائرکٹر تھے ۔ مگر حال ہی میں ان کی ترقی (Promotion) کے احکامات آ گئے ہیں ۔ اور اب وزارت اطلاعات و نشریات میں ہی وہ آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کے عہدہ پر متعین کئے گئے ہیں ۔ مگر

ان کی شخصیت اسقدر بلند ہے کہ عہدہ و منصب کی بلند سے بلند کرسی بھی ان کے لئے چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔

"دلی جو ایک شہر تھا" اردو زبان و ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
یہ پانڈا صاحب کی ہندی کتاب "دلی میں دس ورش" کا اردو ترجمہ ہے۔ ان کی یہ کتاب ہندستان کی دوسری کئی علاقائی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کی دلی کی سماجی۔ تہذیبی۔ معاشی اور سیاسی زندگی کی جھلکیاں پیش کی گئی ہیں۔ واقعات وہی ہیں جو ہمارے اور آپ کے مشاہدہ میں بھی آتے ہیں لیکن پانڈا صاحب کی فکر و نظر اور شخصیت کی چھاپ نے ان معمولی واقعات کو دلچسپ حسین اور دلفریب بنا دیا ہے۔ ادب کو زندگی کا آئینہ دار کہا جاتا ہے۔ ایک ادب پارہ کی تعریف یہی کی جاتی ہے کہ وہ ادیب کے ذہن سے گذری ہوئی زندگی کی کسی حقیقت کو پیش کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی ادبی تخلیق ادبی تخلیق کا روپ اس وقت تک اختیار نہیں کر سکتی ہے جب تک اس پر ادیب کے ذہن کا پرتو نہ پڑے۔ یہ ادیب کا تخیل ہے جو عام اور معمولی باتوں کے بے رنگ خاکہ میں دلفریب و دلکش رنگوں کی آمیزش سے ادبی شاہکار ڈھالتا ہے۔ پانڈا صاحب بھی ایک سچے اور ایماندار ادیب کی طرح زندگی کی حقیقتوں کے ادیب ہیں۔ انھوں نے زندگی کو خاص طور پر دلی کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ روایتی حسن و عشق کی وادیوں میں تخیل کے بے مقصد گھوڑے دوڑانے کے عادی نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں بھی محض افسانہ نہیں ہوتیں بلکہ ان کے لئے بھی وہ حقیقی واقعات سے مواد حاصل کرتے ہیں۔

طنز و مزاح کی چاشنی نے اس کتاب کو اور بھی زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ معمولی واقعات میں مزاح کا پہلو پیدا کرنے میں وہ خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں مرحوم پطرس بخاری کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپ کو طنز کے تیز و نشتر اس کتاب میں ضرور مل جائیں گے۔ مگر ان کے طنز کی تلخی ایک دم محسوس

نہیں ہوتی۔ وہ چپکے چپکے پیچھے سے آکر ذہن پر حملہ کرتے ہیں اور ہماری فکر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں مزاح کا پہلو لطیف اشاروں میں لپٹا ہوا ہے۔ وہ ہمیں قہقہہ مار کر ہنسنے پر مجبور نہیں کرتے۔ ہم صرف زیرِ لب مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔ اس کتاب کے بعض مضامین دلّی کی سماجی و تہذیبی زندگی پر ایک شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔

مگر اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ راجندر لال ہانڈا کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ فن کو فنکار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب کے ہر مضمون پر انھوں نے اپنی دلفریب و دلنواز شخصیت کی چھاپ لگا دی ہے۔ اس کے جملوں میں انسانیت کے درد سے تڑپتے ہوئے دل کا سوز و گداز، روح کی بےچینی اور فکر کی گہرائی و گیرائی کو سمو دیا گیا ہے۔ ہم اس کے الفاظ میں ہانڈا صاحب کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سن سکتے ہیں۔ یہ کتاب ان کی شخصیت کی بولتی اور جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ہانڈا صاحب سے قطعی ناواقف شخص بھی اس کتاب کو پڑھ کر ان کی شخصیت سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے۔ "دلی جو ایک شہر تھا" اپنے طرز کی اردو میں پہلی کتاب ہے جو بلاشبہ اردو زبان و ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اردو داں حلقوں میں یقینی ہی اسے پسندیدگی و مقبولیت کی سند حاصل ہوگی۔

غلام ربانی تاباں

مکتبہ جامعہ - نئی دہلی

۱۱ر جون سنہ ۱۹۶۹ء

(۱)

جب دودھ روپیہ کا نو سیر تھا

ایک پرانی کہاوت ہے کہ "دلّی میں بارہ برس رہے اور بھاڑ ہی جھونکا"۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ابھی یہاں رہتے ہوئے دس ہی برس ہوئے ہیں۔ یہ کہاوت کم از کم ابھی تو مجھ پر صادق نہیں آتی۔ لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن اس کہاوت کا اطلاق مجھ پر ہو کر رہے گا۔ آخر مجھ ہی جیسے انسانوں کے لئے یہ کہاوت بنائی گئی ہوگی۔

صدیوں سے دلّی ہندوستان کی راجدھانی رہی ہے۔ یہاں کبھی مغل شہنشاہ رہتے تھے۔ اور آج صدر جمہوریہ۔ وزیر اعظم اور دوسرے بڑے بڑے افسران رہتے ہیں۔ مغلیہ دور میں اکثر ہر طبقہ کے لوگ قسمت آزمانے دلّی آیا کرتے تھے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔ شاہ عالم نے ایک بار ایک حجام کو داروغہ شہر بنا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دن بادشاہ بہت فکر مند اور رنجیدہ تھے۔ حجام ان کے بال کاٹنے آیا۔ اس نے ان کے سر کی اتنی اچھی مالش کی کہ انھوں نے خوش ہو کر اسے کوتوال کا عہدہ بخشدیا۔ اسی طرح نانبائی۔ مالی۔ معمولی سپاہی اور نہ جانے کس کس کی قسمت جاگی۔ اس لئے

لوگ دلّی کی کرامت کے قائل ہو گئے۔ یہ کرامت مغلوں کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گئی۔ شہنشاہ آتے رہے۔ سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ لیکن دلّی کا جادو برابر قائم رہا۔ اور یہ جادو آج بھی اسی طرح باقی ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوتے ہی ۱۹۳۹ء میں جب میں دلّی آیا میرے دو چار پرانے دوست بھی انھیں دنوں یہاں آن بسے تھے۔ ان میں سے ایک ٹیچر تھے۔ وہ آج بھی یہاں موجود ہیں۔ جب آئے تھے تو کوچہ نٹوں میں ۳۰ روپیہ ماہانہ پر ایک پرائمری اسکول میں کام شروع کیا تھا۔ وہ رہتے قرول باغ میں تھے جو ان دنوں دلّی سے الگ دلّی کے مضافات میں سے تھا۔ ایک دن بہت گھبرائے ہوئے ماسٹر صاحب میرے پاس آئے اور بولے :۔ "بھائی! میں تو کرنال جا رہا ہوں۔ رات بھر مالک مکان سے تو تو میں میں ہوتی رہی۔ ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہے اس کا بھی تین روپیہ کرایہ مانگتا ہے۔ آج تک تو وہ سوا دو خوشی سے لیتا رہا۔ اب نہ جانے اسے کیا دکھائی دے گیا جو۔۔۔۔"

چھٹی کا دن تھا۔ میں ماسٹر صاحب کے ساتھ ہو لیا۔ میں نے سوچا میرے دوست جذباتی آدمی ہیں۔ کہیں مار پیٹ پر نوبت نہ آ جائے۔ قرول باغ پہونچتے ہی میں نے مالک مکان سے بات چیت کی۔ وہ پاس والے مکان میں رہتے تھے۔ دونوں مکان اسی کے تھے۔ اس نے کہا:۔ "ماسٹر جی کو میں یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ ان کے بچّوں نے گھر کے سب کواڑ توڑ دیئے ہیں۔" میں نے کہا "بھائی بچے تو شرارتی ہوتے ہی ہیں۔ تمہارے بچّے بھی شرارتی ہوں گے۔"

غصّہ میں اس نے جواب دیا :۔ "جی ہاں! میرے بچّے بھی ایسے ہی سہی۔ مگر مکان تو میرا ہے۔ ایسی برابری کرنی ہے تو یہ مکان خرید کیوں نہیں لیتے۔ پانچسو پچاس روپیہ میرے حوالے کریں اور پھر مکان ان کا ہے جو چاہیں کریں۔"

میں نے مالک مکان کا یہ چیلنج قبول کر لیا اور اسی دن چار دوستوں سے روپیہ جمع کر کے ماسٹر جی کے حوالہ کیا۔ اگلے ہی دن انھوں نے رجسٹری کر دالی۔ اور پکّے مکان مالک ہو گئے۔

اس جھگڑے کی وجہ سے دوست کی قسمت جاگ اٹھی۔ گھر تو بس اللہ کا نام تھا۔ مگر اس میں تین سو گز جگہ تھی۔ چار سال بعد زمین کی قیمت پچیس روپیہ گز ہو گئی۔ ماسٹر جی سو گز میں خود رہتے رہے اور دو سو گز کے پیسے بنا لئے۔ پیسہ ہاتھ میں آیا تو ماسٹری چھوڑ ٹھیکیداری کی سوجھی۔ وہ آجکل اچھے خاصے دولت مند بن گئے ہیں۔ نئی دلی میں رہتے ہیں اور بغیر کار زمین پر پاؤں نہیں رکھتے ہیں۔

اسی طرح دلّی بہتوں کو راس آئی۔ جنھیں نہیں آئی وہ اب بھی بھاڑ جھونکتے ہیں۔

یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ میرا اصل مقصد تو دلّی کے بارے میں اپنے ذاتی تجربات بیان کرنا ہے۔ جب اکتوبر ۱۹۳۹ء میں میرا دلّی آنا ہوا۔ راجدھانی ویران سی تھی۔ رونق اگر کہیں تھی تو ریلوے اسٹیشن پر۔ کیونکہ شملہ سے سرکاری دفتر واپس آ رہے تھے۔ میں آٹھ دس روز ایک رشتہ دار کے یہاں ٹھہرا۔ پھر ایک دن مکان کی تلاش میں نکلا۔ ایک دوست مجھے بابر روڈ پر لے گئے۔ مارکیٹ پہونچتے ہی میرے دوست نے ایک سبزی بیچنے والے سے کچھ پوچھا۔ اور وہ سبزی والا وزنی سی تالیوں کا ایک گچھا لیکر ہمارے آگے آگے ہو لیا۔ یکے بعد دیگرے اس نے ہمیں چار پانچ مکان دکھلائے۔ چھوٹے مگر صاف ستھرے۔ کوٹھی نما۔ ان میں سے ہم نے ایک پسند کر لیا۔ کرایہ چوبیس روپیہ مہینہ طے پایا۔

بابر روڈ بڑی کھلی اور خوبصورت جگہ تھی۔ اس مقام کی خوبیاں بیان کرنا اب قصۂ ماضی بن چکی ہیں۔ اگلے ہی دن میں اپنے نئے مکان میں آکر رہنے لگا۔ میں نے نوکر سے دودھ کا انتظام کرنے کے لئے کہا۔ میں برآمدہ میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ میرا نوکر ایک ڈیری والے کو پکڑ لایا۔

میں نے کہا: "بھائی ہمیں تین سیر دودھ ہر روز چاہیئے۔"

وہ بڑی اکڑ کے ساتھ بولا: "صاحب! دودھ جتنا مرضی ہو لے لیجئے۔ مگر ایک بات پہلے صاف

ہو جانی چاہیئے۔ ہم لوگ اچھا دودھ بیچتے ہیں۔ شملہ ڈیری سے لاتے ہیں۔ ہمارا دودھ آپ کو مہنگا پڑیگا۔ سستا لینا ہو تو آپ کسی گھوسی .....“

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا: ”آخر تمہارا دودھ کیا بھاؤ ہے؟“

”ہم نو سیر کا لگا لیں گے، جی چاہے آپ لیں یا نہ لیں۔ کمتی بڑھتی نہیں ہوگا۔“ میں نے بھاؤ منظور کر لیا اور سیر سیر کی تین بوتلیں لے لیں۔

ان دنوں ساری دنیا ہی سستی تھی مگر دلّی دنیا سے گز بھر آگے بڑھی ہوئی تھی۔ دودھ گھی۔ پھل۔ سبزی یہاں دوسرے شہروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ سستے تھے۔ وجہ نہ جانے کیا تھی۔ میں نے کئی دکانداروں سے پوچھا۔ ایک پھل والے نے کہا: ”دلّی میں پھل کی مانگ کم ہے اس لئے سستے داموں بیچنے پڑتے ہیں“ جب ایک پرچونئے سے پوچھا کہ روہتک کا گھی روہتک کے مقابلہ میں دلّی میں کیوں سستا ملتا ہے۔ تو جواب ملا: ”بابو جی بھاؤ۔ مانگ پر منحصر ہے۔ یہاں مانگ زیادہ ہے روہتک میں کم۔ اس لئے یہاں چار پیسے کم میں بیچکر بھی پڑتا کھا جاتا ہے۔“

میں تھوڑا بہت علم معاشیات جانتا تھا۔ یہ دلیل سنکر میرا وہ علم بھی خطرہ میں پڑ گیا۔ کس کی بات سچ مانوں کس کی غلط؟ کئی دن غور و فکر کرنے کے بعد بھی میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ہمیں ہر چیز ہی گھر کے سامنے مل جاتی تھی۔ یا ٹیلیفون پر آرڈر دیکر منگا لیتے تھے۔ یہاں کے لوگوں کی ایمانداری اور کاروباری سمجھ بوجھ سے بھی میں کافی متاثر ہوا۔

نوکری کرنے سے پہلے دلّی میں آیا تو کئی بار تھا۔ مگر دو چار دن سے زیادہ یہاں کبھی ٹھہرنا نہیں ہوا تھا۔ یہاں کے گلی کوچوں اور بازاروں سے ایکدم ناواقف تھا۔ یہاں رہتے مجھے کچھ مہینے ہونے کو آئے تھے۔ ایک دن کسی کام کی خاطر مجھے بہت گھومنا پڑا۔ اس دن میں نے کئی نئے بازار دیکھے۔ گھر آکر مجھے اپنے دوست پطرس بخاری کے ایک مضمون کی یاد آگئی۔ وہ

مضمون ہے "لاہور کا جغرافیہ"۔ مسٹر بخاری کی مشہور و معروف کتاب "مضامین پطرس" میں میں نے یہ مضمون پڑھا تھا۔ پطرس نے لاہور کے عجیب و غریب جغرافیہ کا ذکر کیا تھا۔ میں نے سوچا اگر پطرس صاحب دلّی پر کچھ لکھتے تو ان کے مضمون کا عنوان کچھ اور ہی ہوتا۔ جغرافیہ اور تاریخ دلّی کے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ اس میں کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ جناب بخاری صاحب کا تخیل کہیں اور ہی پرواز کرتا۔ شاید ان کے مضمون کا عنوان "دلّی کا حساب" ہوتا۔ حساب سے بڑھ کر دلّی کو کوئی اور عزیز نہیں۔ اس بیان کے لئے میرے پاس ٹھوس دلیلیں موجود ہیں۔ اگر آپ ابھی صدر بازار جائیں تو تھوڑی دور چلکر ہی آپ ایک کھلے چوک میں پہونچ جائیں گے۔ جس کا نام ہے "بارہ ٹوٹی"۔ وہاں سے اگر سیدھے پہاڑ گنج چلے جائیں تو "چھ ٹوٹی" جا پہونچے گے۔ وہاں سے آپ نئی دلّی میں داخل نہیں ہو سکتے جبتک کہ "پنچ کوئی" کے درشن نہ کرلیں۔ اور نئی دلّی پہونچکر آپ "بارہ کھمبا" تو گھومنے نکلئے ہی گا۔ حساب کی اسقدر یادگاریں آپ کو آسانی سے اور کہیں نہیں ملیں گی۔

بارہ کھمبا کا نام لیتے ہی مجھے ایک بات یاد آگئی۔ میرے بڑے بھائی کئی برس دلّی رہے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں وہ دریا گنج سے نئی دلّی آگئے۔ کیونکہ وہاں سے دفتر قریب پڑتا تھا۔ نئے پتہ سے مطلع کرتے ہوئے بھائی صاحب نے مجھے خط لکھا۔ وہ خط اس طرح تھا: "پیارے .... دریا گنج کا مکان چھوڑ اب میں نئی دلّی آگیا ہوں۔ صاف اچھی اور کھلی کوٹھی مل گئی ہے۔ ہاں کرایہ کچھ زیادہ ہے۔ ۲۶ روپیہ ماہانہ ٹھہرا ہے۔ میرا پتہ ہے ۱۳۔ بارہ کھمبا روڈ۔ بارہ کھمبا نئی دلّی کے مضافات میں سے ہے۔ ویران ضرور ہے۔ مگر نئی دلّی سے بہت دور نہیں ہے۔ پھر بھی شاید تلاش کرنے میں تمہیں پریشانی ہو۔ اس لئے آنے سے پہلے خط لکھدینا۔ میں تمہیں اسٹیشن پر مل لوں گا۔"

(۲)

گیہوں اور کوئلہ — ایک دام

تین سال دلّی میں کافی آرام سے گذرے۔ یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ریگستانوں میں لڑائی جاری تھی۔ دلّی لڑائی کی خبروں کو بڑی بے نیازی حوصلہ اور اطمینان کے ساتھ سن اور پڑھ رہی تھی۔ بعض اسباب کی بنا پر دلّی کے لوگ اس جنگ کے نتیجہ کے بارے میں کچھ زیادہ فکرمند نظر نہیں آتے تھے۔ مجھے یاد ہے اپریل ۱۹۴۰ء کی بات ہے کہ ایک دن میں شام کو کچھ دوستوں کے ساتھ کناٹ پلیس میں سیر گشت کر رہا تھا۔ اچانک ایک اخبار بیچنے والا چلایا: "آج کا تازہ اخبار ہٹلر پیرس میں پہونچ گیا۔ سارے فرانس پر نازیوں کا قبضہ۔" سبھی نے یہ خبر سنی۔ ایک لمحہ کیلئے پیشانیوں پر بل پڑے اور پھر سنی ان سنی کر کے سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ میرا دوست برابر ایک کے بعد دوسرا جوتا دیکھتا رہا۔ کسی میں کچھ خرابی بتاتا کسی میں کچھ۔ وہ کسی کا چمڑا خراب بتلاتا تو کسی کا ڈیزائن۔ پیرس میں جرمن فوجوں کے داخلہ کی خبر بوٹ پہننے کے اس کے شوق کو ذرا بھی متاثر نہیں کر سکی تھی۔ سامنے کی دکان سے ایک صاحب تولیہ خرید رہے تھے دکاندار نے تولیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ مگر صاحب کو کسی خاص کارخانہ کا بنا تولیہ چاہئے تھا۔

وہ مل نہیں رہا تھا۔ تولیہ کے ڈھیر کو وہ اچھوتا چھوڑ کر ——— بلا جھجک آگے بڑھ گئے۔

میرے ہاتھ میں دو پیسے کا اخبار تھا۔ میں جیسے ہی دو چار سطور پڑھ لیتا دائیں بائیں آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتا۔ سبھی کام پہلے کی طرح ہو رہے تھے۔ اوڈین (سنیما ہاؤس) کے سامنے آلو ٹکیہ اور چاٹ والا حسب معمول گاہکوں کو چاٹ کے پتے دیتا تھکا جا رہا تھا۔ ہر روز کی طرح سنیما کے سامنے بھیڑ لگی تھی۔ کئی حضرات بغل میں اخبار دبائے ہوئے تھے مگر وہ اس کو پڑھنے کے لئے کوئی خاص مشتاق نظر نہیں آتے تھے۔ فلم ایکٹر اور ایکٹرسوں کے فوٹو انہیں زیادہ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ سرکاری حلقوں میں بھی کوئی خاص گھبراہٹ یا ہلچل نہیں تھی۔ سبھی لوگ شملہ جانے کی تیاری میں تھے۔ ممکن ہے دلّی کی بڑھتی ہوئی گرمی میں افسران کچھ سوچ نہیں پا رہے تھے۔ کلرکوں کی قوم میں بھی کوئی جوش نہیں تھا۔ ایک کلرک کو تو میں نے یہ کہتے سنا: "میاں۔ کوئی ہارے کوئی جیتے۔ سنتوں کی بلا سے۔ یہاں تو کلر کی کرنی ہے۔ ہم پر کون سواری گانٹھتا ہے۔ اس سے ہمیں کیا مطلب۔ جیسا انگریز ویسا جرمن"۔

جنگ عظیم کے ابتدائی دو سالوں میں زیادہ تر کا یہی رویہ تھا۔ جنگ کا اثر ہم لوگوں پر پڑا ہی کیا تھا۔ سب بیکار لوگوں کو نوکری مل گئی۔ ٹھیکیداروں نے ہاتھ رنگ لئے۔ سرکاری افسروں کی تنخواہیں اس تیزی سے بڑھنے لگیں کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لڑائی کا پہلا دور ہمارے لئے شیریں ہی شیریں تھا۔ تلخی اس میں نام کو نہ تھی۔ ہاں البتہ ہمارے لیڈر غیر مطمئن تھے۔ عوام بھی کانگریس کے ساتھ وفاداری دکھانے کے لئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ دراصل اس جنگ نے عوام کے لئے بہت سے امکانات کے دروازے کھول دیئے تھے۔ لیکن اس کو ہمارے لیڈروں کی حمایت حاصل نہ تھی۔ وقت کے مطابق یہ دونوں اپنے اپنے فرض کو پورا کر رہے تھے۔ عوام بلاشبہ کانگریس کے ساتھ تھے۔ لیکن وہ آنکھ بچا کر سرکاری جنگی تیاریوں میں بھی

مدد دیتے تھے۔ اس مدد کا جنگ کے نتیجہ یا سرکاری اپیلوں سے اسقدر تعلق نہیں تھا جتنا کہ خود غرضی اور دولت سمیٹنے کے لالچ سے۔

۱۹۴۱ء ختم ہوتے ہی بساط الٹ گئی۔ جاپان جنگ میں کودا اور ہمیں بھی ہوا کا جھونکا محسوس ہوا۔ لڑائی کی خبروں میں دلّی کے لوگوں کی دلچسپی بڑھی۔ جنگ کے شعلے انھیں پہلی بار ہندستان کی طرف لپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ دلّی کے لوگ اب جہاں کہیں ملتے اور گفتگو ہوتی تو گھر گرہستی کے مسائل کے ساتھ جنگ کی خبروں پر بھی تبصرہ کر لیتے۔ اب ضروریات زندگی کی چیزوں کی طرف بھی توجہ جانے لگی۔ چینی ایک دم بڑھ کر چار آنے سے سات آنے سیر ہوگئی۔ ابھی چینی کو لوگ رو رہے تھے کہ اناج بازار سے غائب ہوگیا۔ جسے یہ بھی پتہ نہ ہوتا تھا کہ گھر میں آٹا کس بھاؤ کہاں سے اور کتنا آتا ہے وہ صحیح معنوں میں "آٹے دال کے بھاؤ" کی فکر میں ڈوب گیا۔

اتوار کے دن مجھے ایکبار آٹے کی تلاش میں چار گھنٹے پہاڑ گنج کے چکر لگانے پڑے۔ جس سے پوچھا وہ یہی قسمیں کھاتا کہ دکان میں آٹا یا اناج نہیں ہے۔ باقی سب کچھ ہے۔ اس معاملہ میں میں کچھ انجان سا بھی تھا۔ ہمیشہ نوکر کے بھروسہ پر یہ کام چلاتا آیا تھا۔ میں ان قسموں کا مطلب نہ سمجھ پایا۔ خوش قسمی سے شری کلونت رائے مل گئے۔ جنھوں نے دو ماہ پہلے ہی میرا بیمہ کیا تھا۔ دیکھتے ہی وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ میں نے کہا: "دوست! اس وقت آٹا چاہیئے۔ گھر میں مشکل سے ہی سیر آٹا ہوگا۔ کہیں سے دلوایئے نا۔"

کلونت رائے تو سدا کے شریف انسان تھے اور وہ دوست کو مصیبت میں دیکھ کر پگھل بھی پڑتے تھے۔ اسی لئے وہ کامیاب بیمہ ایجنٹ تھے۔ انھوں نے مجھ سے بیٹھے رہنے کا اصرار کیا اور کہا کہ وہ خود بیس سیر آٹا کہیں سے لے آئیں گے۔ وہ چلے گئے اور آدھ گھنٹہ میں آٹا

لے کر لوٹ آئے بیس سیر آٹا ساڑھے آٹھ روپے کا تھا۔

گھر پہونچکر آٹے کی بوری رکھدی اور میں نے اسے اس انداز سے دیکھا جیسے ایک شکاری اپنے مارے ہوئے شکار کو دیکھتا ہے۔ دو دن بعد ہی ایندھن ختم ہوگیا گیہوں کی طرح کوئلہ بھی تلاش جستجو کے بعد پہاڑ گنج سے بڑے احسان اٹھانے کے بعد حاصل کیا گیا۔ ایسا ہی حال چاول۔ گھی۔ تیل وغیرہ کا ہوا۔ ان چیزوں کی باقاعدہ اور منظم تلاش کی وجہ سے افسر اور کلرک چھوٹے اور بڑے سبھی ایک صف میں آکر کھڑے ہوگئے۔ اور چھوٹائی بڑائی کا فرق بڑی خوبصورتی سے ختم ہوگیا۔

راشن اسکیم نافذ ہو جانے کے بعد بھی آٹا دال ہی بہت سوں کی زندگی کا مقصد بنا رہا۔ ویسے تو یہ سلسلہ دلّی کی روایت کے عین مطابق ہے مگر پھر بھی ابتدا میں یہ کچھ ناگوار گذرا۔ ہمارے مرحوم نانا جی دلّی میں بیس سال رہے۔ کہا کرتے تھے کہ دلی میں ہمیشہ سے دو قسم کے لوگ ہی رہتے ہیں۔ ایک تو وہ جنکو سدا آٹا دال بیچنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ اور دوسرے وہ جن کا مقصد ہی یہ چیزیں خریدنا اور ان کو ہضم کرنا ہے۔ اسی لئے دلّی میں بڑے بڑے ہوٹل ہیں۔ دفتر اور گھر میں مگر لائبریری ایک بھی نہیں۔ دلّی کی آب و ہوا کسی بھی ثقافتی جد و جہد کے لئے سازگار نہیں ہے۔ نانا صاحب کے اس قول کی سچائی ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں پوری طرح میرے دل پر نقش ہوگئی۔

جنگ کے حالات کا دلّی پر ایک اور بھی اثر پڑا۔ پہلے تو سرکاری دفتر دلّی کا ایک حصّہ تھے۔ اب دلّی ان دفتروں کا حصّہ بن گئی تھی۔ دفتروں۔ ملازموں۔ دفتر بنانے والوں اور دفتر میں ملازم رکھنے والوں کی تعداد اسقدر بڑھ گئی کہ باقی دلّی اس بڑھتے ہوئے سیلاب میں ڈوب گئی۔ ایک دن تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ بڑودہ سے ایک دوست کا خط آیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ میں کسی کام کے سلسلہ میں ایک شخص سے ملوں جو مان سنگھ روڈ پر رہتے تھے۔ خط میں کوٹھی کا نمبر نہیں دیا

گیا تھا۔ کام بہت ضروری تھا۔ اسی دن میں مان سنگھ روڈ پہونچا۔ خط میں بنائی گئی جگہ کے مطابق میں ایک کوٹھی کے اندر گیا۔ سامنے والے کمرہ میں دیکھتا کیا ہوں بہت سے لوگ بیٹھے ٹائپ کر رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک صاحب میرے پاس آئے۔ میں نے کہا شری ان ساہو واسن جی سے ملنا ہے۔ جواب ملا۔ ”یہ تو سرکاری دفتر ہے جی۔ سپلائی محکمہ کی شاخ ایل سیکشن ۱۳“۔ میں الٹے پاؤں واپس ہولیا۔ پھر سے خط نکال کر پڑھا۔ کہیں میں غلطی پر تو نہ تھا۔ چونکہ ساتھ والی کوٹھی بھی ویسی ہی تھی۔ میں نے اس میں گھسنے کی دوبارا ہمت کی۔ اندر پہونچنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ سنتری نے گیٹ پر ہی روک دیا۔ پوچھنے پر پتہ چلا وہاں محکمہ خوراک کی کوئی شاخ ڈٹی ہوئی ہے۔ میں ناامید تو ہو ہی چکا تھا۔ لوٹنے سے پہلے ایک کوشش اور کرنی مناسب سمجھی۔ اسی سڑک کے آخر میں ایک بڑی سی عمارت کی طرف میں بڑھا۔ اندر جاکر سیٹھ واسن جی کے بارے میں پوچھا۔ ایک سفید پوش شخص نے بڑھ کر سلام کیا اور پوچھا سیٹھ صاحب کس محکمہ میں کام کرتے ہیں اور ان کا عہدہ کیا ہے۔

”کیسا محکمہ۔ کیسا عہدہ؟“ میں نے چلا کر کہا۔ ”وہ تو بڑودہ کے لکھ پتی تاجر ہیں۔“ اس سڑک پر ان کی دو تین کوٹھیاں ہیں۔ آجکل دلّی آئے ہوئے ہیں۔“ میرا استقبال کرنے والے نے معافی چاہی اور کہا: ”یہ تو جناب سرکاری افسروں کا ہوسٹل ہے۔“

دلّی جس بے تکے ڈھنگ سے پھیل رہی تھی، اس سے میں واقف تھا۔ پھر بھی اس دن کے حادثہ سے مجھے حیرانی ہوئی۔ زیادہ تر بڑی بڑی خالی کوٹھیاں اور راجاؤں کے محل سرکار نے حاصل کر لئے تھے۔ کسی میں دفتر اور کسی میں دفتر والے آ بسے تھے۔ درجنوں سڑکوں پر کھائیاں کھودی جارہی تھیں۔ اور ہوائی حملہ سے بچنے کے انتظامات کئے جا رہے تھے۔ کلکتہ پر ایک دو حملے ہو چکے تھے۔ دلّی میں جگہ جگہ عجیب وغریب پناہ گھر بنائے گئے تھے۔ جو دیکھنے ہی بنتے تھے۔ سائرن بجا کر

اور اندھیرا کر کے دلّی والوں کو حملہ سے حفاظت کی مشق بھی کرائی گئی۔

اس خوف پھیلانے والی ریہرسل سے دلّی کے لوگوں میں کوئی خاص بےچینی نہیں پھیلی۔ بلکہ تھوڑا بہت تفریح ہی ہوئی۔ مالدار لوگ شاید گھبرائے ہوں۔ لیکن جن کو صرف اپنے جسموں کی حفاظت ہی کرنی تھی ان کو پناہ گھروں اور ترچھی خندقوں پہ ہی بھروسہ تھا۔

مشقیں ہوتی رہیں۔ جاپانی منی پورہ میں آپہونچے۔ کلکتہ پہ دشمن کے حملہ کی پیش گوئیاں شروع ہوگئیں۔ مگر دلّی والے بےچین نہیں ہوئے۔ جامع مسجد پہ ہر شام کے وقت وہی بھیڑ۔ چاندنی چوک میں وہی رونق۔ اور کناٹ پلیس میں وہی پہلے جیسی چہل پہل بنی رہی۔ دشمن کے حملہ کا خطرہ سب کو تھا۔ لیکن اس مقدس سرزمین پر دشمن کا آنا مفید ہوگا یا غیر مفید اس سوال کے سلسلہ میں واضح خیالات صرف چند ہی کے ہوں گے۔ بلا شبہ اکثریت ان لوگوں کی تھی جو جاپانیوں کو خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ مانتے تھے۔

کچھ بھی سہی ان حالات میں دلّی کے لوگ پریشان ہونا نہیں جانتے ہیں۔ اقتدار کی تبدیلی، سلطنتوں کی بربادی۔ غیر ملکی حملے۔ ان سب باتوں کو تو دلّی والے ہزاروں برس سے دیکھتے آئے ہیں۔ ان حادثوں نے دلّی کی تہذیب۔ یہاں کے رہن سہن۔ رسم و رواج اور طرزِ فکر کو بھی متاثر کیا ہے۔

●●

۳

سماجی زندگی کی ایک جھلک

۱۹۳۹ء۔۴۰ء کی دلی کا تصور کرتے ہی تاریخ کا ایک باب نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے کیسے تھے وہ عجیب و غریب دن! جب کشمیری گیٹ سے اورنگ زیب روڈ (نئی دلی) تک جانا ایک بڑا سفر دکھائی دیتا تھا۔ کم از کم مجھے اتنی دور جانے کے لئے کئی دن پہلے دل میں اپنے کو تیار کرنا پڑتا تھا۔ آنے جانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بسیں تھی ہی نہیں۔ تانگیں خوب سستے ملتے تھے۔ مگر بہت دور جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ دلی اور کسی بھی دوسرے ڈھنگ کے شہر کے تانگوں میں وہی فرق ہے جو دیا سلائی کی ڈبیہ اور مضبوط لکڑی کے ڈبے میں۔ دونوں میں لکڑی ضرور لگی ہوتی ہے۔ لیکن ایک اتنا ہلکا پھلکا کہ آندھی میں بلا گھوڑے کے اڑ سکتا ہے۔ دوسرا ذرا بھاری اور بڑا ہوتا ہے۔ مگر ان دنوں دلی کے تانگوں میں کچھ سدھار ہوا ہے۔

آمد و رفت کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس لئے نئی دلی اور پرانی دلی میں اتنا ہی میل جول تھا جتنا گاہک اور دکاندار میں ہوتا ہے۔ اصل میں سرکاری ملازمین کے

نقطہ نظر سے شملہ پرانی دلّی کے مقابلہ میں نزدیک پڑتا تھا۔ پہلے مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ کچھ دنوں میں ہی یہ بات ثابت ہوگئی۔ ایک دوست سپلائی کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ نئی دلی آنے سے پہلے پانچ برس شملہ میں رہ چکے تھے۔ یہاں آتے ہی انھیں سرکاری مکان مل گیا تھا۔ ایک سال بعد انھیں کچھ وجوہات سے سول لائنز (پرانی دلّی) میں مکان لینا پڑا۔ ۱۹۴۲ء سے آجتک وہ وہاں رہ رہے ہیں۔ شاید وہیں وہ ریٹائر ہو جائیں گے۔ کیونکہ اب وہ نئی دلّی میں سرکاری مکان پانے کے حقدار نہیں ہیں۔ اس طرح شملہ نئی دلّی کا محلہ ٹھہرا اور پرانی دلّی دوسرا شہر۔ مکان کے بارے میں ان سرکاری قانونوں سے دونوں دلّیوں کے باہمی تعلق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

ویسے تو پرانی دلّی ہی روائتی دلّی تھی۔ نئی دلّی تو سچ مچ ہی نئی تھی۔ نئی دلّی کی زندگی پر آگے چل کر غور کریں گے۔ آج پرانی دلّی کی سیر کیجیے۔

چاندنی چوک اور کشمیری گیٹ رہنے والے کئی دوستوں کے یہاں میرا آنا جانا تھا۔ ایک دوست کٹرہ نیل میں رہتے تھے۔ یہ کافی مالدار تھے اور کم از کم بیس مکانوں کے مالک تھے۔ ایک دفعہ چھٹی کے روز ان کے یہاں جانا ہوا۔ خیال تھا سب لوگ ملکر قطب چلیں گے۔ میرے دوست کا نام کیلاش ہے۔ بیٹھک میں کیلاش کے والد اور دوسرے گھر کے لوگ بیٹھے تھے۔ نمسکار کرنے کے بعد میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ آدھے گھنٹہ کے بعد کیلاش بھی آگئے۔ ان کے پیچھے ایک اور صاحب بھی تھے۔ یہ تھے کیلاش کے خاندانی جیوتشی۔ کیلاش کے والد نے جیوتشی جی کے پاؤں چھوئے اور کہا: "چھوٹا منا کسی کام سے کلکتہ جا رہا ہے۔ آپ کوئی تاریخ نکالیں تو اس کو بھیجنے کی تیاری کروں۔"

مجھے کافی تعجب ہوا کہ کیلاش اور ان کے بھائی کافی پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ پھر بھی

جیوتش سے ان کے جانے کا وقت اور دن طے کرتے ہیں۔ پتہ چلا کہ یہ ان کے خاندان کی روایت ہے۔
اس لئے اسے جاری رہنا ہی چاہیئے۔ میں بیٹھا بیٹھا اکتا گیا۔ کیلاش سے پوچھا قطب چلنے کا
ارادہ ہے یا نہیں؟" ضرور چلیں گے گھبراؤ مت۔"

یہ جواب پاکر کچھ اطمینان ہوا۔ اتنے میں والد صاحب کا حکم ملا کہ منّے کو حکیم صاحب کے
یہاں لے جانا ہے۔ حکیم بھورے خاں بلیماران میں مطب کرتے تھے۔ میں بھی کیلاش کے
ساتھ ہو لیا۔ بہت سے مریض ایک کمرہ میں بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص نام
پکارتا تھا۔ اور ایک ایک کرکے مریض حکیم صاحب کے روبرو پیش ہوتے تھے۔ ماحول
ہسپتال کا نہیں کچہری کا تھا۔

آخر ہم لوگوں کی بھی باری آئی۔ حکیم بھورے خاں کے ٹھاٹ دیکھ کر بہت تعجب
ہوا ٹھیک مغلیہ دور کے انداز میں وہ بیٹھے تھے۔ چاندنی بچھی ہوئی تھی، حقہ کسی دوسرے
کمرہ میں ہوگا۔ بجلی کے تار کی طرح حقہ کی نلی حقہ کو حکیم صاحب سے ملائے ہوئے تھی۔ دور سے
ہی انھوں نے منّے کو دیکھا۔ کچھ سوالات کئے اور فوراً ہی نسخہ لکھ کر کیلاش کے حوالہ کیا۔
باہر آکر میں نے کیلاش کو برا بھلا کہا۔ وہ دقیانوسی حکیم اگر جادوگر ہی ہو تو شاید مریضوں کو اس کے
علاج سے فائدہ ہو جاتا ہوگا۔ لیکن دو ہفتہ بعد منّے کی صحت کے بارے میں جو خبر ملی اس سے
یہی ثابت ہوا کہ بھورے خاں جادوگر ہیں۔

قطب جانے کا خیال چھوڑنا پڑا۔ بڑی دیر ہو چکی تھی۔ سب لوگ ہاتھ پاؤں دھوکر
کھانا کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ ہر تھال میں آٹھ آٹھ کٹوریاں تھیں۔ ان میں سے چار میں چٹنی
اور اچار وغیرہ تھے باقی میں مرچوں کی تہہ سے ڈھکی سبزی اور دالیں تھیں۔ میں مرچ کھانے کا
عادی نہیں۔ اس لئے تھوڑے سے چاول چٹنی وغیرہ سے کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کیلاش کے ساتھ میرا گھر کا سا تعلق تھا۔ کوئی تکلف نہیں تھا۔ شام کے وقت جب بھی میں ان کے یہاں گیا۔ ہمیشہ چاٹ اور دہی بڑے سے میری تواضع کی گئی۔ اصل میں دلی کے لوگ شام کے وقت چائے بہت کم پیتے تھے۔ اکثر چاٹ ہی کھاتے تھے۔ میں نے چاٹ بیچنے والوں کی دو چار دکانیں دیکھیں۔ ان کے صرافوں کے سے ٹھاٹ تھے۔ کئی کئی نوکر، گاہکوں کی بھیڑ۔ سینکڑوں روپیوں کی روزانہ بکری۔ پتہ لگا کہ امپیریل بینک کے پاس ایک چاٹ والا ایک چھوٹے سے کمرہ کا ستر روپیہ ماہانہ کرایہ دیتا ہے۔ خیال کیجئے ۱۹۳۹ء میں یہ کرایہ کتنا زیادہ تھا۔ جبکہ چالیس روپیہ میں اچھی خاصی کوٹھی رہنے کے لئے مل جاتی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ چاٹ والوں کا کاروبار کتنا چمکا ہوا تھا۔

پرانی دلی میں تفریح کے ذرائع گنے چنے ہی تھے۔ رئیس لوگ تو دو گھوڑوں کی فٹن میں بیٹھ کر چار پانچ میل دور کی ہوا خوری کو ہی تفریح سمجھتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ کے لئے قدسیہ باغ میں بنچ پر بیٹھ لئے۔ درمیانی درجہ کے لوگ جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان جو وسیع میدان ہے اس میں بیٹھ کر یا گھوم پھر کر دل بہلاتے تھے۔ ان میدانوں میں درجنوں ٹولیاں ادھر ادھر بیٹھی دکھلائی دیتی تھیں۔ کہیں تاش۔ چوپڑ یا شطرنج کی بازی گرم ہوتی تھی۔ کہیں کویتا پاٹھ (شعروشاعری) یا فلمی گیت گائے جاتے تھے۔ کہیں کہیں سنجیدہ لوگ بیڑی پیتے ہوئے بازار بھاؤ اور سونا چاندی کے نرخوں پر بات چیت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ کچھ شوقین نوجوان کپڑے بدلکر ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارموں پر چہل قدمی کو ہی تفریح سمجھتے تھے۔ سنیما گھروں میں اسقدر بھیڑ نہیں ہوتی تھی۔ اس صنعت کے مالکان دلی کو تیسرے درجہ کا شہر مانتے تھے۔

پڑھنے لکھنے کے پیشہ سے دلی والے سدا ہی دور رہے۔ یہاں ان دنوں چار یا پانچ

کالج تھے۔ جن میں کم از کم تین چوتھائی باہر کے طالب علم پڑھتے تھے۔ میں نے ایک صاحب سے اس کی وجہ پوچھی۔ تو جواب ملا۔ "اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ یہاں صدیوں سے تین ہی قسم کے لوگ رہتے آئے ہیں۔ ایک تو وہ جنھیں خاندانی رئیس کہتے ہیں۔ جو یا تو واقعی رئیس ہیں اور کھانے کمانے کی طرف سے قطعی بے فکر ہیں۔ یا وہ جو امیری کے خیالی تصور کے سہارے ہی کچھ نہ کرنے میں ہی اپنی عافیت خیال کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے وہ درمیانی لوگ ہیں جو تجارت۔ منیم گری منشی گری نوکری وغیرہ پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اتنا ہی پڑھ لکھ لینا یہ لوگ کافی سمجھتے ہیں جس سے دکانداری یا نوکری کے کام میں مدد ملے۔ تیسرے مزدور لوگ ہیں جن کا تعلیم سے اِسقدر تعلق ہے جتنا میرا یا آپ کا ریلوے انجن سے۔ اب بتلایئے پڑھے تو کون پڑھے جو تھوڑے بہت یہاں کے لڑکے کالجوں میں دکھلائی دیتے ہیں وہ نئی دلّی کے ہیں۔"

دلّی کے گلی کوچوں میں گھومنے والا کوئی بھی شخص ایک انوکھی چیز کو دھیان سے دیکھے بنا نہیں رہ سکتا۔ وہ چیز ہے پالکی۔ پردے کا رواج اٹھ جانے سے اب یہ چیز کم ہو گئی ہے لیکن ان دنوں گلی کوچوں میں یہاں وہاں پالکیاں ہی پالکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ دلّی کی پردہ نشین خواتین کے لئے شہر کے اندر آنے جانے کا صرف ایک یہی ذریعہ تھا۔ صبح ہی صبح بہت سی ہندو خواتین پالکی میں بیٹھ کر جمنا پر غسل کے لئے جاتی تھیں۔ کبھی کبھی تو گھاٹ کے پاس پالکیوں کی ایسی بھیڑ ہوتی تھی جیسے آجکل ریلوے اسٹیشن کے سامنے تانگوں کی ہوتی ہے۔

کیلاش کو پالکی کی خوبیوں نے بہت متاثر کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے پالکی بہت خوبصورت اور ایک صاف ستھری سواری ہے۔ اس میں حادثہ کا کوئی ڈر نہیں میونسپل کمیٹی کو بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ کیونکہ پالکی اٹھانے والے کہار سڑکوں کو گندہ نہیں کرتے ہیں۔ جبکہ تانگوں کے گھوڑے بلا سوچے سمجھے جہاں چاہتے ہیں لید یا پیشاب

کر دیتے ہیں۔

اپنی زندگی کی تمام ہی خوبیوں سے دلّی والوں کو پیار ہے۔ اپنے رسم و رواج کے بارے میں وہ جب بھی غور کرتے ہیں انہیں ذاتی ضرورتوں اور تقاضوں کے ٹھیک مطابق خیال کرتے ہیں۔ دلّی والے تبدیلی اور ترقی پسندی کے خلاف نہیں ہیں مگر وہ بے مطلب رنگ بدلنے کے بھی حق میں نہیں ہیں۔

●●

(۴)

سماجی زندگی کا دوسرا پہلو

بہت سے لوگ فن اور کلچر کے نقطہ نظر سے دلّی کو خالی مانتے ہیں۔ یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ دلّی کی سماجی اور ثقافتی روایات اسی قدر اہم اور قدیم ہیں جسقدر کہ کسی بھی دوسرے تاریخی شہر کی۔ شاید دوسرے بڑے شہروں کے مقابلہ میں دلّی کا ماضی زیادہ شاندار رہا ہے۔ تاریخ میں تو دلّی کا ایک بلند مقام ہے ہی۔ فن اور تہذیب کے میدان میں بھی وہ کم درجہ نہیں رکھتی ہے۔ دور مغلیہ کے ادب سے دلّی کا خاص تعلق ہے۔ ادیبوں، فنکاروں اور شاعروں کو شاہی دربار میں پہلا مقام دیا جاتا تھا۔ اس دور کی روایات کم و بیش سنہ ۱۹۴۷ء تک چلی آتی رہیں۔ دراصل دلّی اس پرانے تالاب کے مانند ہے جس کی دیواروں پر کئی انچ موٹی کائی جم گئی ہو۔ جو کوئی بھی جلد بازی سے کام لے گا وہ پھسلے گا اور گرے گا۔ اسی لئے دلّی کی روایتی تہذیبی زندگی کو سمجھنے کے لئے تھوڑی محنت اور ہمدردانہ مطالعہ کی ضرورت ہے۔

پچھلے دس سالوں میں دلّی کی سماجی زندگی میں جو انقلاب آیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی

ہے۔شہنشاہوں کے قتل۔سلطنتوں کے الٹنے۔اور جنگوں کی تباہی و بربادی سے بھی کبھی اتنی تبدیلی نہیں آئی ہوگی۔ انقلابات آئے۔ دلّی برباد ہوئی۔گلی کوچے خون سے لالہ زار ہو گئے۔ مگر وقت کے مرہم نے سبھی زخموں کو مندمل کر دیا۔یہ سب تبدیلیاں ڈھلتی پھرتی دھوپ چھاؤں سے زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوسکیں۔مگر ان دس سالوں میں جو تبدیلیاں دیکھنے میں آرہی ہیں وہ مستقل معلوم ہوتی ہیں۔ دلّی ہمیشہ کے لئے اپنی روائتی زندگی کو الوداع کہہ رہی ہے اس لئے یہ اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ یہاں کی پچھلی سماجی زندگی کو ایک بار پھر مڑ کر دیکھا جائے۔

ماضی کی یادیں :-

۴۰ - ۱۹۳۹ء میں راجدھانی کی زندگی کا دھارا پرسکون طریقہ پہ بہہ رہا تھا۔سینکڑوں میل کی دوری پر ہونے والی جنگ کی سنسنی خیز داستانوں سے تو وہ کیا متاثر ہوتی۔ اسکی خود کی سرزمین پہ بیشمار جنگیں لڑی جا چکی تھیں۔ یہ کہاوت مشہور ہے کہ کوئی مال مست کوئی کھال مست۔ دلّی اپنی پرانی یادوں کی کھال میں مست تھی۔ فیروز شاہ کوٹلہ یا اور کسی بھی سیر و تفریح کی جگہ صبح و شام کوئی بھی شخص دلّی کی بیفکری کا ثبوت پا سکتا تھا۔صرف ایک مثال کافی ہوگی۔

اکثر اتوار کو میں فیروز شاہ کوٹلہ گھومنے جایا کرتا تھا۔اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ایک دن گھومتے پھرتے وہیں آٹھ بج گئے۔ لوٹ ہی رہا تھا کہ مجھے آواز سنائی دی۔

"بابو صاحب ذرا ہماری بھی سنیئے۔ ایک فیصلہ کر دیجئے۔"

جدھر سے آواز آئی تھی میں ادھر مڑا۔ دیکھا باہر کے لان میں پرانی رئیسی وضع قطع کے پندرہ بیس حضرات بیٹھے ہیں۔ انھیں میں سے ایک نے مجھے بلایا تھا۔ سفید چکن کا کرتا۔ تنزیب کا انگرکھا۔ چست پاجامہ۔ گول ٹوپی۔ سلمہ ستارہ کی وصلی جوتی۔ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ

سب کا ایک سا لباس تھا۔ ایک دو کی سفید داڑھی ان کی بزرگی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔
میں اس دلچسپ مجمع کی طرف بڑھا۔ گھاس پہ بیٹھے یہ لوگ خوش گپیاں کر رہے تھے پاس ہی تین دبنے چر رہے تھے۔ ان کی رسیاں اسی محفل کے تین آدمیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ بانس کے دو پنجروں میں تیتر ٹائیں ٹائیں کر رہے تھے۔ جیسے ہی میں پہونچا۔ ایک سفید ریش بزرگ نے مجھے بیٹھنے کیلئے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے وہ بزرگ بولے:
"معاف کیجئے گا بابو صاحب خوامخواہ آپ کو تکلیف دی۔ ذرا ان صاحب کی دلیل سنئے۔ یہ فرماتے ہیں کہ ہٹلر چھ ماہ کے اندر اندر برطانیہ کا بادشاہ بن جائے گا۔ فرانس کو مات دینا اور بات ہے۔ برطانیہ سے لوہا لینا دوسری بات ہے۔ چچا مرحوم کا قول یاد آتا ہے۔ غدر میں وہ سو روپیہ کی شرط جیتے تھے۔ ایک رئیس ان سے اُلجھ گئے اور بولے یہ ماہ ختم ہونے سے پیشتر ہندوستان کے سب انگریز ٹھکانے لگا دیئے جائیں گے۔ چچا نے دنیا دیکھی تھی۔ کئی سال وہ نظام اور ہولکر کی فوج میں رہ چکے تھے۔ انہوں نے رئیس زادے سے کہا آخر میں انگریز حالات پر قابو پالیں گے اور باغیوں کو ختم کر دیں گے۔ سو روپیہ شرط ٹھہری۔ چچا کی بات ٹھیک نکلی۔ ان انگریزوں کے خون میں نہ جانے کیا ہے۔ پٹتے ہیں یہ، اور ہار ہوتی ہے ان کے دشمن کی۔ سو قبلہ میں اس خیال کا ہوں۔ اس بار بھی ہٹلر ہی مات کھائے گا۔ مولانا حمزہ مجھ سے متفق نہیں اور شرط پر آترے ہیں۔"
میں کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ مولانا حمزہ بول اٹھے "جناب بھائی جان نے آپ کو فضول تکلیف دی۔ جنگ کی باتیں ہم ضرور کر رہے تھے۔ پر اصل میں سوال تو شرط کا تھا۔ مجھے اپنے دھنے تیتر پر بھروسہ ہے میاں عثمان کو اپنے چتلے پرند پہ۔ ہم دونوں شرط لگا کر ان پرندوں کو بھڑانے ہی جا رہے تھے۔ کہ بھائی جان ہمیں جنگ کی طرف گھسیٹ لے گئے۔ اور

اصرار کیا کہ اگر شرط رکھنی ہی ہے تو کسی بڑی بات پر رکھی جائے۔"

میاں اسماعیل اس بیان کی تصدیق کرتے ہوئے بولے:۔

"بھائی جان بزرگ ہیں۔ ان کا بڑھاپا اب شرط کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس لئے آنجناب نہ تیتروں کو بھڑنے دیتے ہیں نہ دنبوں کو۔ خدا کی قسم میرا دمبا بھائی جان کی بدولت کاہل ہو گیا ہے۔ اچھا ابھی عید میں دو ماہ ہیں۔ مجھے بھی قسم ہے اگر کم سے کم دو مقابلوں سے پہلے حلال کرنے کا نام بھی لوں۔"

تراہا بیرم خاں کے رئیسوں اور نوابوں کی اس گفتگو میں بڑا لطف آیا مگر مجھے دیر ہو رہی تھی۔ اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

جادو نگری:۔

یہ لوگ اکثر مجھے صبح فیروز شاہ کوٹلہ اور کبھی کبھی شام کو لال قلعہ کے سامنے پریڈ گراؤنڈ میں خوش گپیوں یا شعر و شاعری میں مصروف ملتے۔ چوپٹ یا شطرنج کی بازی بھی کئی بار ان کے ساتھ جمی۔ مولانا حمزہ سے میری خصوصی دوستی ہو گئی ایک بار ان کے یہاں کھانے پر بھی گیا تھا۔ تراہا بیرم خاں کی ایک تنگ اور گندی سی گلی میں ہم گئے۔ حمزہ نے انگلی سے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا ٹوٹے ہوئے بھدے سے دروازے پر پردوں یا چقوں کی بجائے بوریئے کے ٹاٹ لٹک رہے تھے۔ میں دل میں گھبرا رہا تھا کہ اس گندی جگہ کیسے کچھ کھانے کو دل چاہے گا۔

ٹاٹ کا ٹکڑا اٹھا کر ہم ایک اندر بڑی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ ڈیوڑھی سے آگے بڑھتے ہی جو نظارہ دیکھا اس سے مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی جادو نگری میں پہونچ گیا ہوں۔ میرے سامنے انگوٹھی میں جڑے ہیرے کی مانند ہرا بھرا باغ تھا جس کے تین طرف خوبصورت دو منزلے مکان بنے تھے۔ میں حمزہ کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ آخر ایک بہت ہی آراستہ

خوبصورت کمرہ میں مجھے بٹھایا گیا۔ وہاں چار اور حضرات موجود تھے ان کی طرف دیکھتے ہوئے حمزہ نے کہا: "آپ ہیں میرے محترم ہندو دوست۔" میں آگے بڑھا۔ ایک ایک کر کے چاروں سے ہاتھ ملائے۔ حمزہ تعارف کراتے گئے: "آپ ہیں شفاء الملک اعلیٰ نباض حضرت نواب فرحت علی خاں۔ دہلی کے بہترین طبیبوں میں آپ کا شمار ہے۔ آپ ہیں فخر قوم سیّد ریاست علی جن کے بزرگ عالمگیر کے بعد سلطنت مغلیہ کے تیس سال تک وزیر رہے۔ حاجی عنایت بیگ میرے مہربان دوست۔ دلّی کے بہت بڑے سوداگر ہیں۔ اور آپ ہیں ملّت پرور شہزادہ نیک بخت خاں دلّی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دولت انگلشیہ سے وظیفہ پاتے ہیں۔"

تعارف کے بعد چمکدار دستر خوان پہ ہم لوگوں نے بڑا پر تکلف کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت مولانا حمزہ ایک ایک برتن اور کمرہ میں پڑی ایک ایک چیز کی تاریخ مجھے بتلاتے رہے۔ میری توجہ کھانے کی طرف زیادہ تھی۔ اتنا ہی یاد ہے کہ وہ شیر شاہ سوری سے لیکر آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک سب کے نام بار بار لیتے رہے۔

کئی روز کے بعد مولانا حمزہ اور ان کے ساتھیوں سے جامع مسجد کے سامنے میدان میں ملاقات ہو گئی۔ شطرنج کی بازی جمی ہوئی تھی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے حمزہ سے پوچھا: "کیا آپ لوگ دن بھر یہی کرتے ہیں اس سے آپ کا جی نہیں اکتاتا؟"

حمزہ بولے: "جناب دلّی میں رہتے جس کی طبیعت اکتا جائے وہ صریحاً موت کا طالب ہے۔ دلّی کے علاوہ کوئی اور جگہ ایسی بتلائیے جو سو سال تک دل بہلاتی رہے۔ دل سے اِسے خاص لگاؤ ہے تبھی تو اس کو دلّی کہتے ہیں۔ یہاں عمارات۔ باغات۔ سیرگاہیں

اتنی ہیں کہ تفریح کے لئے زندگی بھر باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں دو سو سے اوپر مزارات ہیں اگر انسان ان میں سے ایک چوتھائی پر بھی ایمان لائے تو سمجھو سیر و تفریح کا مطلب ہی حل ہوگیا۔ شاید آپ آس پاس کم گھومے ہیں۔ کیا بتائیں ہماری فرشی ٹمٹم حاجی داؤد کھیل والے استعمال کر رہے ہیں۔ نہیں تو آپ کو اپنے ساتھ لیجا کر یہ سب مزار دکھلاتا۔"

کیف و لطف میں ڈوبی زندگی اور زندگی سے گہرا لگاؤ۔ غیر معمولی حسن اخلاق۔ بے پناہ اطمینان اور مثالی رواداری۔ یہ خصوصیات جتنی دلّی کے پرانے مسلمانوں میں میں نے پائی ہیں وہ نہ لکھنؤ میں نہ الہ آباد میں اور نہ حیدر آباد میں دکھائی دیں۔ زندگی کا اتار چڑھاؤ۔ بزرگوں کی حکایات۔ اسلامی حکومتوں کے آثار جیسے ان لوگوں کے لئے خدا کی برکتیں ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا زوال ہو چکا ہے۔ پھر بھی ان میں ہنسنے اور ہنسانے کا حوصلہ ہے۔ سختی ان کی زندگی کو چھو تک نہیں پائی ہے۔

۵

دلّی جو ایک شہر تھا

جنگ شروع ہونے سے چھ ماہ پہلے نئی دلّی کس قدر صاف ستھری اور پرسکون تھی۔ اس کا تصور کرکے ہی آج سکون ملتا ہے۔ ان دنوں بہت زیادہ بھیڑ بھاڑ تو کہیں تھی ہی نہیں۔ پر نئی دلّی میں صرف بھیڑ کی کمی ہی محسوس نہ ہوتی تھی بلکہ اس سے زیادہ مکانوں اور بنگلوں کی بہتات بھی تھی۔ کناٹ پلیس سے ڈیڑھ میل کسی طرف چلے جائیے خوبصورت بجلی کی لالٹینیں اور ان کے پیچھے وسیع بنگلے ہی دکھائی دیتے تھے۔ بہت سے بنگلوں میں شاید کوئی رہتا ہی نہیں تھا۔ کم از کم باہر سے ان میں زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ پی ڈبلیو ڈی کے ایک افسر سے پتہ چلا کہ ۱۹۳۷ء ۱۹۳۸ء میں انہیں ایک خاص مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دوسرے شہروں میں تو لوگ گھر تلاش کرتے ہیں۔ نئی دلّی میں حکومت نے اسقدر مکان بنا دیئے تھے کہ مکانوں کے لئے آدمی ڈھونڈے جاتے تھے۔ سرکاری ملازموں کو مختلف طریقوں سے ترغیب دیجاتی تھی بعض دفعہ مجبور تک کیا جاتا تھا کہ وہ سرکاری کوارٹروں میں رہیں۔

ساؤتھ اینڈ کچنر روڈ۔ اورنگ زیب روڈ وغیرہ سڑکیں تو قطعی سنسان پڑی رہتی تھیں کہ یہاں مجھ جیسا کوئی دیوانہ ہی لطف اٹھا سکتا تھا۔ میرے دوست کیلاش چند جو کٹرہ نیل کے ماحول میں پلے ہیں اس ویرانی کو شمشان گھاٹ کا سکون کہا کرتے تھے۔ لیکن میرے لئے وہ پندرہ روز جب میں اورنگ زیب روڈ پر گپتاجی کی کوٹھی میں ٹھہرا زندگی کے قیمتی پندرہ برس سے کم نہیں معلوم ہوئے۔ وہ کوٹھی کا اکا۔ شملہ روڈ پر واقع کسی بھی آرام گھر سے کم پر سکون معلوم نہیں ہوئی۔ اس جگہ کی ویرانی۔ بے کیفی اور اکیلے پن سے کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا تھا جیسے میں کسی اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں پڑا ہوں۔

۱۹۳۹ء میں نئی دلّی کی آبادی صرف چالیس ہزار تھی۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ آبادی سردیوں کے زمانہ کی تھی۔ گرمیوں کے موسم میں تو بیس ہزار سے کم ہی رہ جاتی ہوگی۔ ان دنوں دھان کے کھیت کی طرح نئی دلّی کی بہار بھی موسمی ہوتی تھی۔ گرمی میں اکثر سبھی دفتر اور کناٹ پلیس کے دکاندار بھی شملہ چلے جایا کرتے تھے۔ اور تو اور کئی اسکول بھی بابو لوگوں کے ساتھ ہی شملہ منتقل ہو جاتے تھے۔

دلّی کی سب سے بڑی خوبی :-

دلّی کی سب سے بڑی خوبی یہاں کی صفائی تھی۔ کیا گلیاں کیا سڑکیں۔ سبھی تیر کی طرح سیدھی اور سلیٹ جیسی صاف ستھری رہتی تھیں۔ مکھی یا مچھر نام کی کوئی چیز یہاں ہوتی ہی نہ تھی۔ پرانے شہر کے لوگ اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ نئی دلّی میں تو وہ رہے جسے مکھی سے بھی دشمنی ہو۔ بات بالکل ٹھیک تھی۔ یہاں کی میونسپلٹی کا سب سے اہم کام یہاں کی سڑکوں پر جھاڑو دلوانا اور نالیوں میں مٹی کا تیل چھڑکتے رہنا ہے۔

بمبئی۔ کراچی۔ مدراس کسی بھی شہر سے آنے والے لوگ نئی دلّی کی صفائی سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہتے تھے۔ اتفاق رائے سے یہ شہر ہندوستان کا سب سے صاف شہر کہلانے لگا تھا۔ نئی دلّی میں رہنا یا دکان کرنا فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ شاید اسی لئے کشمیری گیٹ بازار اجڑ گیا اور وہاں کے سبھی بڑے بڑے تاجر کناٹ پلیس میں آ بسے۔ پرانی دلّی کے کچھ امیر لوگ بھی یہاں آ کر رہنے لگے تھے۔

بابو گڈھ:۔

یہ سب ہوتے ہوئے بھی نئی دلّی خاص طور پر سرکاری ملازمین کی ہی بستی تھی۔ یہ لوگ یہاں کی آبادی کا تین چوتھائی حصّہ تھے۔ باقی لوگ آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ اس لئے نئی دلّی کا ماحول ناقابل برداشت حد تک دفتری تھا۔ چاہے آپ گول مارکیٹ کے کسی دکاندار سے کچھ خرید رہے ہوں۔ یا بئیرڈ روڈ پر کسی درزی کو سوٹ کا ناپ دے رہے ہوں یا کافی ہاؤس میں کافی پی رہے ہوں۔ یا کناٹ پلیس کے کسی لان میں چہل قدمی کر رہے ہوں۔ آپ کے کانوں میں کسی نہ کسی کونے سے دفتری کارروائی کی بھنک ضرور پڑے گی۔ کوئی اپنے نئے افسر کی برائی کر رہا ہوگا۔ کوئی ترقی کے وسائل کی بحث میں مست ہوگا۔ اور کوئی اپنی چھٹیوں کا حساب لگا رہا ہوگا۔ اس میں برائی بابو لوگوں کی ہی نہیں تھی۔ دکاندار انھیں خود چھیڑ بیٹھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کسی بھی بابو سے دفتر کی بات کرنا دکان پر بیٹھنے کے لئے مدعو کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے۔ گول مارکیٹ کے سبھی کپڑے والے۔ کتب فروش اچھے درزی وغیرہ اپنے سب گاہکوں کی دفتری حالت سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ ان گاہکوں کو گانٹھنے کا دفتر کی گپ شپ سے بڑھ کر اور کونسا طریقہ ہو سکتا تھا۔

بابو لوگوں کی زندگی بڑے اطمینان اور آرام کی زندگی تھی۔ ان دنوں سبھی کچھ سستا تھا۔ ان لوگوں کی ساکھ بھی کم نہ تھی۔ جو چاہیں ادھار خرید لیں۔ دکاندار اکثر ادھار کو نقد سے اچھا سمجھتے تھے۔ اور پیسے مانگتے ہمیشہ ہچکچاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں ادھار کی اسقدر آسانیاں کسی اور طبقہ کو کبھی حاصل نہیں ہوئی ہوں گی۔ جتنی ان دنوں نئی دلّی میں بابو لوگوں کو حاصل تھیں۔ داڑھی منڈوانے سے لے کر بیوی کے لئے بنارسی ساڑی خریدنے تک سب ہی کاروبار ادھار پہ چلتا تھا۔

ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آگیا۔ میرے گاؤں کے ایک مسلمان جناب جمال الدین کسی دفتر میں اسسٹنٹ تھے۔ ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ بچے انگریزی اسکول میں پڑھتے تھے۔ خانسامہ مالی۔ آیا وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک موٹر کار بھی رکھ چھوڑی تھی۔ ایک دن میرے یہاں کھانا کھانے آئے۔ میں نے پوچھا:-

"حضرت آپ کا بہت خرچ ہے تنخواہ بھی کافی ہوگی"۔ بولے:-

"ہاں اچھی گذر ہو رہی ہے۔ ۲۵۰ روپیہ تنخواہ ہے۔ خرچ تو اس سے زیادہ ہی ہے۔ مگر کوئی دقت نہیں ہوتی کیونکہ سو روپیہ ماہانہ تک قرض آسانی سے مل جاتا ہے"۔

گویا مولانا قرض کو بھی آمدنی کا ایک حصہ مانتے تھے۔ نئی دلّی میں ایسے فراخدل لوگوں کی کافی تعداد تھی۔

سرکاری گماشتوں کا شہر:-

سیاسی ہلچل سے نئی دلّی بالکل الگ رہی ہے۔ اگست ۱۹۴۲ء سے پہلے شاید ہی کبھی عوامی یا سرکاری مظاہرے ہوئے ہوں۔ میں نے ایک بار کیلاش کے والد صاحب سے اس سلسلہ میں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا کہ ایک ایسا شہر جہاں اکثر سبھی تعلیم یافتہ ہیں کانگریس

جیسی مقبول تحریک سے کیسے بالکل الگ رہ سکتا ہے۔ وہ خود بھی کٹر کانگریسی تھے۔ اور دلّی کی نس نس سے واقف تھے۔ کچھ مُسکرا کر بولے: "بیٹا تمہیں نئی دلّی میں رہتے ابھی سال بھر ہی ہوا ہے۔ میں نے اسے پیدا ہوتے اور گھٹنوں کے بل کھیلتے دیکھا ہے۔ اسے جو گھٹّی پلائی گئی ہے اس کی تاثیر ہی نرالی ہے۔ دیکھو! نئی دلّی صرف سرکاری افسروں۔ بابوؤں اور چپراسیوں کی بستی ہے۔ یہ لوگ دفتر کی ہی دنیا میں رہتے ہیں۔ باہر کی دنیا سے انھیں زیادہ کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ شام کو یہ لوگ دفتر سے فارغ ہوتے ہیں۔ پھر اپنی اپنی مالی حیثیت کے مطابق سینما۔ کلب۔ سنگیت۔ گھومنا پھرنا وغیرہ جیسی تفریحات کا سہارا لیتے ہیں۔ بس دن ختم ہوا۔ مختصراً نئی دلّی ایک ایسا شہر ہے جہاں پبلک تو ہے ہی نہیں۔ سبھی سرکار کے گماشتے ہیں۔ پھر یہاں کسی بھی سیاسی ہلچل کا کیا کام؟"

بابو جی کی یہ بات بالکل سچ تھی۔ مگر اب زمانہ بدل رہا ہے۔ جنگ کے تیسرے سال میں نئی دلّی بھی کروٹیں لے رہی تھی۔ شملہ کی اونچی چوٹی سے اِس کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا سکریٹریٹ میں بھیڑ ہو چلی تھی۔ اس عظیم الشان عمارت کے سبھی گوشے اور صحن کمروں میں تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ کناٹ پلیس میں بھی جگہ جگہ نئی عمارتیں کھڑی کی جا رہی تھیں۔ غیر ملکیوں اور ہندوستانی ٹھیکیداروں کا دلّی ایک بہت بڑا مرکز بن گئی تھی۔ پہلے جیسی خاموشی اور سکون اب ماضی کی باتیں تھیں۔ بابو لوگوں کو ادھار ملنا بند ہو گیا تھا۔ مکھی۔ مچھر بھی کہیں کہیں بھنبھنانے لگے تھے۔ پرانی دلّی جو اکثر کناٹ پلیس سے دور پڑتی تھی اب قریب آتی جا رہی تھی۔ نئی اور پرانی ـــــ یہ دو الفاظ اب دو شہروں کے صرف نام رہ گئے تھے ـــــ اپنی صفات کے حامل نہ تھے۔

●●

۶

بڑے لاٹ صاحب کا دفتر

جنگ کے دوران اگر مجھ سے کوئی پوچھتا کہ دلّی میں کون کونسی چیزیں قابل دید ہیں۔ تو میں ایکدم کہہ دیتا بڑے لاٹ صاحب کا دفتر یا ۔ سکریٹریٹ ۔ اس دفتر کی اہمیت تو ہمیشہ سے ہی رہی ہے ۔ مگر جنگ کے دنوں میں خاص طور سے اور بھی بڑھ گئی تھی ۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مسلمانوں کی بنوائی تاریخی عمارتیں سکریٹریٹ کی صرف شاخیں ہیں ۔ کیا لال قلعہ کیا پرانا قلعہ اور کیا چھوٹی بڑی دوسری خالی عمارتیں ۔ یہ سب کی سب سکریٹریٹ کی رگوں کے مانند بن گئی تھیں ۔

مگر میں ان لوگوں میں سے ہوں جو لڑائی سے پہلے بھی لاٹ صاحب کے دفتر کو دلّی کی اہم ترین عمارت مانتے تھے ۔ سکریٹریٹ کو بنے ابھی دس ہی سال ہوئے تھے ۔ اس کا افتتاح تو ہو چکا تھا ۔ پر کچھ لوگ نہ جانے کیوں اسے الگ الگ ناموں سے پکارتے تھے ۱۹۲۹ء میں میں نے پہلی بار سکریٹریٹ کے دیدار کئے ۔ جب میں ریل گاڑی سے اترا تو مجھے تعجب ہوا کہ سکریٹریٹ کا مطلب کوئی تانگے والا بھی نہیں سمجھتا ۔ وہ لوگ اسے لاٹ صاحب کا دفتر کہتے تھے ۔ مزدور لوگ اور کچھ دلّی کے پرانے آدمی اسے

رائے سینا کا قلعہ کہتے تھے۔

میں اپنے دوست کیلاش کے یہاں ٹھہرا تھا۔ ایک دن شام کو کیلاش کے والد۔ ان کے دو منیم۔ کیلاش اور میں گھومتے پھرتے نئی دلی آ نکلے۔ منیم کے اصرار پر ہم لوگ سکریٹریٹ آ نکلے۔ ان لوگوں نے یہ دفتر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لوک سبھا کے کونسل بھون اور سکریٹریٹ کے چوک میں کھڑے ہوکر چھوٹے لال منیم خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ سکریٹریٹ کے چوک میں کھڑے ہوکر انھوں نے ایکبار پھر نارتھ بلاک اور ساؤتھ بلاک پر نظر ڈالی۔ اور کہا: "انگریزوں نے مغلوں کو بھی مات کر دیا۔ جب چالیس پچاس برس بعد یہ عمارت بھی لال قلعہ اور قطب کا درجہ حاصل کرے گی۔ تو بلا شبہ ہی دلی میں سیاحوں کے لئے اس عمارت کی کشش نمبر اوّل ہوگی۔ دوسری تاریخی عمارتیں اس کے آگے پانی بھریں گی۔"

چھوٹے لال کی بات پر سب کو ہنسی آگئی۔ مگر کیلاش کے والد جو فطرتاً سنجیدہ واقع ہوئے تھے جھنجھلا کر بولے: "تم بڑے منحوس ہو چھوٹے لال ابھی دس سال ہوئے کروڑوں روپیہ کی لاگت سے یہ عمارت بنی ہے۔ تم ابھی سے اس کو آثار قدیمہ کے نقطہ نظر سے دیکھنے لگے ہو۔"

مجھے دلی میں کئی ہفتے رہنا پڑا۔ اور دو ماہ بعد تو اس شہر سے تعلق ہی قائم ہوگیا۔ سکریٹریٹ کے ماحول۔ اور اس میں کام کرنے والوں کے طور طریقوں سے میں بہت متاثر ہوا۔ سکون۔ پیارا اور ظاہری سکھ کی جیسی حکومت یہاں تھی ویسی کسی صوفیوں کی خانقاہ میں ہو تو ہو۔ اور کہیں آسانی سے دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ صاف اور وسیع سڑکوں پر سویرے دس بجے کچھ رونق ہوتی تھی جسے بھیڑ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ حقیقت میں سبھی طرف سے سیکریٹریٹ پہونچنے والی سڑکیں اسقدر چوڑی دکھائی دیتی تھیں اور ان پر چلنے والے آدمی اتنے کم تھے کہ سڑک کے درمیان سے ہوکر چلنے کو جی چاہتا تھا۔ ۱۱ بجے تک سرکاری ملازم دفتروں میں آجاتے تھے۔ کام بہت کم تھا۔

پھر بھی جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے کچھ اتھل پتھل کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

۱۹۴۴ء تک یہ اتھل پتھل لوگوں کے دلوں تک ہی رہی۔ سرکاری فائلوں پر ظاہر نہیں ہوئی۔ دن کے وقت بھی سکریٹریٹ سنسان دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ سکریٹریٹ کے دونوں بازؤں میں کل ملاکر دو ہزار کے قریب آدمی کام کرتے تھے۔ جبکہ ۱۹۴۵ء میں یہ تعداد چھ ہزار سے بھی بڑھ گئی تھی۔

دوپہر کے وقت کا نظارہ اور بھی پرکشش تھا۔ افسر لوگ تو اکثر کھانا کھانے کے لئے گھر جاتے تھے۔ یا اپنے کمرہ میں ہی لنچ کرتے تھے۔ دوسرے نیچے درجے کے ملازم باہر ہری گھاس پر بیٹھ کر دھوپ کھاتے تھے۔ اور وہیں اپنے بجٹ کے مطابق جیبوں سے نکالکر چلغوزے یا مونگ پھلی چباتے تھے۔

چار بجے چائے کا وقت ہو جاتا تھا۔ چار بجے ہی اکثر سبھی ملازم مختلف چائے کے ہوٹلوں میں چلے جاتے۔ (افسر مستثنیٰ) اور ساڑھے چار بجے دفتر ختم ہوتا تھا۔ کسقدر خوبصورت پروگرام تھا یہ۔ لنچ چائے وغیرہ کے سہارے دن بڑا مزے سے گذرتا تھا۔

باہمی حسد جلن۔ برائی۔ یا کینہ کا نام تک کہیں سنائی نہیں دیتا تھا۔ سبھی لوگ کلرک اور چپراسی تک بھی جیسے اطمینان وسکون کی مورتیاں تھے۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اس زمانہ میں ترقی کے مواقع بہت کم تھے۔ دفتروں کی وسعت کی بات ہی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ جو جہاں تھا وہیں رہ کر کام کرتے رہنے میں مطمئن تھا۔ دوسرے ترقی کے ضابطے ان دنوں بڑے سخت تھے۔ بے ایمانی کے امکانات کم تھے۔ اور اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے کا تو کوئی ڈر تھا ہی نہیں۔ تیسرے۔ سب کچھ سستا تھا۔ سو روپیہ ماہانہ پانے والا بھی اپنے آپ کو امیر مانتا تھا۔ سرکاری نوکروں کو ساری دنیا قسمت والا سمجھتی تھی۔

اس دور کے سرکاری ملازمین کا لباس خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سبھی لوگ سوٹ پہنتے تھے۔ ٹائی لگاتے تھے۔ ایک سے ایک سجے بنے دکھائی دیتے تھے۔ صرف دیکھ کر افسر

اور کلرک میں فرق کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ یہاں ایک دوست کی بات یاد آگئی۔ وہ محکمہ تجارت میں ڈپٹی سکریٹری تھے۔ ایک دن وہ دو دن دفتر نہیں گئے۔ میں سمجھا بیمار ہو گئے ہوں گے۔ اس لئے شام کو ان کے گھر پہونچا۔ بیوی کے ساتھ انہیں بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے دیکھ کر حیرانی میں پڑ گیا۔ کھیل ختم ہونے کے بعد جب ہم بیٹھے تو میں نے دفتر نہ پہونچنے کا سبب معلوم کیا۔ شریمان بولے "یار عجیب مصیبت ہے ہم لوگ سالوں پٹنہ میں رہے ہیں، دلّی کی زندگی سے کم واقف ہیں۔ کیا بتاؤں جب سے یہاں آیا ہوں دیکھتا ہوں میرے دفتر میں سب سے گندے کپڑے میرے ہی ہوتے ہیں۔ میں اپنے اسٹینو سے پریشان ہوں وہ اس قدر چست اور ٹھاٹھ دار سوٹ پہنکر آتا ہے کہ اگر ہم دونوں کو باتیں کرتے کوئی باہر کا آدمی دیکھے تو اس کو افسر سمجھے گا۔ اسی لئے میں نے پچھلے ہفتہ "چیپ جان" کو دو سوٹوں کا آڈر دیا ہے خیال تھا کہ کل تیار ہو کر آجائیں گے۔ مگر ابھی ابھی اس نے بھیجے ہیں۔ جو گرم کپڑے میرے پاس تھے وہ سب گندے ہیں۔ اسی لئے دو دن دفتر نہیں جا سکا"

اپنی مخصوص پوشاک کی وجہ سے سرکاری ملازم دلّی کے کسی بھی کونے میں گھوم رہا ہو فوراً پہچانا جاتا تھا۔ جیسے چھٹی پر گیا ہوا فوجی دیہات میں دور سے ہی پہچان لیا جاتا ہے۔ ویسے ہی کناٹ پلیس یا چاندنی چوک یا کشمیری گیٹ میں بھٹکتا ہوا بابو فوراً ہی دکھائی دے جاتا تھا۔

اس ٹھاٹھ اور خوشحالی کا ایک اور بھی سبب تھا۔ پورا سیکریٹریٹ گرمیوں میں شملہ جایا کرتا تھا۔ خوب اچھے بھتے ملتے تھے۔ دلّی میں لوگ بسنت کے بعد ہی شملہ کی تیاری میں لگ جاتے تھے۔ اور ادھر شملہ میں دشہرہ کے بعد ہی دلّی کے خواب دیکھنے لگتے تھے۔ اصل میں دیکھا جائے تو یہ مسلسل آواگون کا ماحول اس زندگی میں کسی کے بھی لئے جنت سے کم نہیں تھا۔ کچھ لوگ اپنا پیار مخصوص گھر یا شہر کو دے بیٹھتے ہیں۔ یہ جھوٹا پیار زندگی کے تئیں ہمارے نقطہ نظر کو خراب کر دیتا ہے۔ سرکاری ملازم کی روح اس بندھن سے آزاد تھی۔ اس لئے وہ اکثر اپنے آپ کو

عوام سے کچھ اونچا مانتا تھا۔ وہ پوری دلّی اور شملہ پر اپنا حق سمجھتا تھا۔

یہ احساس ۱۴ روپیہ ماہانہ پانے والے چپراسی تک میں موجود تھا۔ آج چپراسیوں کو سو روپے بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان دنوں وہ چودہ روپیہ میں بھی خوش تھے۔ ان کے بھائی رشتہ دار جو گاؤں میں کھیتی باڑی کرتے ہوں گے ان کے مقابلہ بلاشبہ کم خوشحال اور کہیں زیادہ غیر مطمئن ہوں گے۔ مرحوم پروفیسر برج نارائن جو ہندوستانی معاشیات کے ماہر مانے جاتے تھے۔ یہ اکثر کہا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا بھی ہے کہ دس بیگھہ زمین میں دن رات جان کھپا کر کھیتی کے ذریعہ کسان جو حاصل کرتا ہے۔ دفتر کا چپراسی چھ گھنٹے معمولی کام کر کے اس سے زیادہ بنا لیتا ہے۔

یہ تھا ۱۹۳۹ء۔۱۹۴۰ء میں بڑے لاٹ کے دفتر کا ماحول اور وہاں کے ملازمین کا حال۔

اس ماحول کا جب ہم آج ۱۹۵۰ء میں تصور کرتے ہیں تو ہم اس دور کو "ست یگ" کا نام دیئے بنا نہیں رہ سکتے۔ معاشیات کے بڑے عالم و پنڈت اور صاحب اقتدار وزیر چاہے کچھ ہی کہیں۔

(۷)

اگست ۱۹۴۲ء

انہیں دنوں جب مغرب میں لڑائی تیزی سے جاری تھی اور جاپانی فوجیں آگ کی طرح من مانے طریقے سے چاروں طرف پھیلتی جارہی تھیں۔ دلّی نے ایک نیا معجزہ کر دکھایا۔ دلّی نے تاریخ کے جس قدر اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا ان میں زیادہ تر ایک ہی کام رہا ہے۔ وہ سدا لٹتے آئے ہیں۔ روائتی طور پہ دلّی والے امن پسند اور برسراقتدار سرکار کے وفادار مانے جاتے ہیں۔تیمور۔ نادر۔ ابدالی۔ سبھی نے یہاں سے بیشمار دولت لوٹی اور جی بھر کر خون بہایا۔ لیکن یہاں کی ماضی پرست زندگی کے اصول ذرہ برابر کبھی نہیں بدلے۔ ان اصولوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کرنے کا فخر موجودہ نسل کو حاصل ہے۔

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد سارے ملک میں بےچینی اور غم کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ کانگریس اور دوسری سیاسی پارٹیاں بھی انگریزوں سے مفاہمت کی امید چھوڑ چکی تھیں۔ قوم کے پتا مہاتما گاندھی کی یہی مانگ تھی کہ انگریز بھارت سے چلے جائیں۔ اور ہمیں ہماری قسمت پر چھوڑ دیں۔

یہ تحریک زور پکڑ گئی۔ کانگریس کی تحریک آزادی کے تیس سالوں میں عوام میں اس قدر بےچینی شاید ہی پہلے کبھی پیدا ہوئی ہو۔

اگست کا مہینہ آیا۔ ۹ تاریخ کے اخباروں میں مہاتما گاندھی اور دیش کے دوسرے رہنماؤں کی گرفتاری کی خبریں سب نے پڑھیں۔ بہت سوں نے غصہ سے ہونٹ چبائے۔ ہر طرف حیرانی سب ہی کو ہوئی۔ دس بجے تک میں اخبار کا پہلا صفحہ ہی پڑھتا رہا۔ دوسری خبروں پر توجہ نہیں گئی۔ یا انھیں پڑھنے کی خواہش ہی نہیں ہوئی۔ گیارہ بجے میں گھر سے نکلا۔ کناٹ پلیس پہونچتے ہی میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ گھروں اور دکانوں کی چھتوں پر چڑھے کچھ دیکھ رہے ہیں میں بھی ایک دوست کے گھر میں گھسا اور چوٹی پر جا پہونچا۔ وہاں پہلے ہی بھیڑ جمی تھی۔ سب لوگ پرانی دلّی کی طرف منہ کئے کھڑے تھے۔ ادھر سے کالے دھوئیں کے بھیانک بادل اٹھ رہے تھے۔ جو آسمان میں پہونچکر ساون کی گھٹاؤں کو بھی مات کر رہے تھے۔ یہاں سبھی اندازہ لگا چکے تھے کہ یہ ہولناک آگ لگنے کی علامت ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں کے تین چار ستون اور اٹھے۔ سبھی تماشائی خوفزدہ تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ دیر بعد خبر ملی ٹاؤن ہال۔ پیلی کوٹھی۔ ریلوے اسٹیشن اور کچھ دوسری عمارتوں کو کسی نے آگ لگادی ہے۔ دھوئیں کے بادل برابر اونچے اٹھ رہے تھے۔

ان حادثوں کی خبر سنتے ہی کوئی یہ نہ کہہ سکا کہ ان کا ذمہ دار کون ہے یا ان کے پیچھے کوئی سازش بھی ہے۔ شام تک اس راز کا پتہ چلا۔ دیش کے سبھی حصّوں سے فسادات اور آگ لگنے کی خبریں آنے لگیں۔ سبھی جان گئے رہنماؤں کی گرفتاری کے غم و غصہ میں یہ عوام کے کارنامے تھے۔ دلّی بھی اس طوفان سے بچی نہیں۔ یہاں تک کہ صاحبوں اور بابوؤں کی بستی نئی دلّی بھی جوش کھا گئی۔ کناٹ پلیس میں کئی غیر ملکی تجارتی اداروں پر لوگوں نے پتھر پھینکے۔ شیشے توڑ پھوڑ دیئے اور جو کچھ ہاتھ آیا اسے جلا دیا گیا۔ دو چار وارداتیں مار پیٹ کی بھی ہوئیں۔ ۹ اگست کا دن سنسنی سے

بھرپور تھا۔ ہرآن شہر کی اور باہر کی خبریں آرہی تھیں۔ ان میں بہت سی بنا سر پیر کی افواہیں بھی تھیں۔ ایک صاحب بھاگتے ہوئے یہ کہتے جارہے تھے۔ "مٹھائی کا پل توڑ دیا گیا ہے ریلوے اسٹیشن کو توڑ دیا گیا ہے۔ اب لال قلعہ کی بھی خیر نہیں ہے۔" بہت سے لوگوں نے ان افواہوں پر یقین کر لیا۔ کیوں کہ ان کو بے بنیاد ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ گھر سے باہر نکلنا خطرہ کا کام تھا۔ اخباروں میں جو خبریں پڑھنے کو ملتی تھیں ان سے افواہوں کی تصدیق ہوتی تھی۔ اخبار پڑھنے کے بعد اگر کوئی یہ سنتا کہ جمنا میں طغیانی آگئی ہے اور اس کے بہاؤ کا رخ زمین کاٹ کر نئی دلی کی طرف کر دیا گیا ہے تو اسے بھی شاید ناممکن یا غلط نہ سمجھا جاتا۔

۱۱ راگست کی خبروں کے مطابق وائسرائے کی کابینہ کے ایک ہندوستانی ممبر گم ہو گئے تھے۔ وہ دورہ پر مدراس گئے ہوئے تھے۔ ۹ راگست کو ریل کے ذریعہ وہ وہاں روانہ ہوئے۔ راستہ میں ریل روک لی گئی۔ کئی میل آگے پیچھے ریل کی پٹری اکھاڑ دی گئی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ ممبر موصوف بھی جنگل میں ہی بھٹکتے رہ گئے۔ اگر یہ واقعہ سچ ثابت ہو سکتا ہے تو جمنا میا کو پارلیمنٹ اسٹریٹ میں گھسنے سے کون روک سکتا ہے۔ ایسا لوگوں کا سوچنے کا ڈھنگ تھا۔

دلی میں کئی صوبائی دفتروں میں آگ لگائی گئی۔ انکم ٹیکس آفس کے سبھی کاغذات راکھ کر دیئے گئے۔ بہت سی سڑکوں پر بجلی کے کھمبے توڑ مروڑ دیئے گئے۔ دلی کے سرکاری علاقوں میں بڑی گھبراہٹ تھی۔ دلی کی زندگی منتشر ہو گئی تھی۔ سبھی بازار بند رہنے لگے۔ پھل سبزی دودھ تو ایک طرف آٹا دال حاصل کرنے میں دشواری ہونے لگی۔ پھر بھی باہمی تعاون کے جذبہ کی وجہ سے لوگوں کو کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔

ان حادثوں کے اگلے ہی دن حکومت کے ظلم وستم کا سلسلہ شروع ہوا۔ گرفتاریاں تو معمولی باتیں تھیں۔ جگہ جگہ گولیاں چلنے لگیں جہاں کہیں بھی آٹھ دس آدمی ایک جگہ دکھائی

دیتے گولی چلادی جاتی۔ دلّی میں سبھی مقامات پر گوری فوج کا پہرہ لگا دیا گیا۔ بیشک حکومت کو ہندوستانی فوج پر بھروسہ نہیں تھا۔ ہاں گوروں کے ساتھ کہیں کہیں ہندوستانی سپاہی دکھائی دیتے تھے۔ دس دن میں کم از کم پچاس بار گولی چلائی گئی۔ سرکاری اندازوں کے مطابق ۲۵ افراد مارے گئے۔ چالیس پچاس زخمی ہوئے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں یہ اعداد و شمار بالکل غلط تھے۔ پچیس سے زیادہ گولی کا نشانہ بنے ہوں گے۔ ان دنوں بارہ گھنٹہ کا کرفیو لگا ہوا تھا جو لوگ کرفیو کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ ان میں سے تقریباً آدھے ہی بچکر واپس گھر آتے تھے۔ کیونکہ ان دنوں وارننگ دینے کا رواج نہیں تھا۔ کم سے کم گورے تو گولی کے ذریعہ ہی وارننگ دیتے تھے۔ یہ میں اندازہ سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے خصوصی معلومات حاصل ہوئی تھیں جو کچھ اس طرح تھیں....

پندرہ دن سے ہمارا دھوبی نہیں آیا تھا۔ تقریباً دو سو کپڑے دھلائی کے لئے گئے ہوئے تھے۔ میرے پاس پہننے کو ایک کپڑا بھی نہیں رہ گیا تھا۔ ۲۱ اگست کے دن میں دھوبی کی تلاش میں چونا منڈی پہاڑ گنج پہونچا۔ تھوڑی بہت معلومات کے بعد اس کے گھر کا پتہ چل گیا۔ دروازہ پر پہونچتے ہی میں نے سیتا کو آواز دی۔ کچھ دیر بعد ایک بڑھیا باہر آئی۔ جیسے ہی میں نے سیتا کے بارے میں پوچھا وہ آنکھیں پونچھنے لگی۔ پھر کچھ سنبھل کر رندھے ہوئے گلے سے بولی، "سیتا کو مرے تو آج ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا۔ ساتھ میں رمضان بھی تھا وہ بھی گیا۔ اور تو اور ظالموں نے اس بیل کو بھی نہیں چھوڑا جس پر کپڑے لدے تھے۔"

بڑھیا کی درد بھری کہانی سے میں بیچین ہو اٹھا۔ بہت کچھ دلاسا دینے کی کوشش کی مگر بڑھیا روتی ہی رہی۔ بات یہ تھی کہ سیتا کہیں سویرے ہی پانچ بجے سے پہلے کپڑے بیل پر لاد کر گھر سے نکل پڑا۔ اس بیچارے کو شاید کرفیو کا تو پتہ ہو مگر وقت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ آسمان کے تارے

اس کے لئے گھڑی کا کام دیتے تھے۔ ابھی کرفیو ختم ہونے میں دس پندرہ منٹ تھے۔ جیسے ہی بیل جھومتا ہوا نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن کے سامنے پہونچا سیتا اپنے بیٹے سمیت گولی کھا کر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

ایسی حالت میں کپڑوں کی بات کرنا نامناسب تھا۔ اپنا سامنہ لئے اور غم کا بوجھ اٹھائے میں واپس گھر کی طرف چلا آیا۔ اسی طرح کے بہت سے حادثات پہاڑ گنج چاندنی چوک اور دلّی کے دوسرے حصوں میں ہوئے۔ لوگوں کا اندازہ تھا کہ کم از کم ۱۵۰ آدمی گولی سے مارے گئے۔

دو ہفتے تک دلّی میں پورا سناٹا رہا۔ کبھی تو بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ درجنوں آدمی حملہ کرتے کرتے پکڑے گئے تھے۔ سرکار کے عمل میں انتقام کا جذبہ تھا۔ بلیا اور بہار کا بدلا وہ دلّی میں لینا چاہتی تھی۔ انگریز حاکموں نے آگا پیچھا نہیں دیکھا۔ جس نے سر اٹھایا اسی پر چوٹ کی۔ ملک کے بہت سے روزنامے اور ہفتہ وار اخبار بند کر دیئے گئے۔ دلّی کا مشہور انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز اور کئی ہندی کے روزنامے اسی لپیٹ میں آگئے۔ اور کئی ماہ تک بند رہے۔ سب سے برا حال ذرائع آمد و رفت کا تھا۔ ریلیں جیسے گہن میں آگئی تھیں۔ میرے ایک رشتہ دار مراد آباد سے تیسرے دن دلّی پہونچے تھے۔ وہ بھی اپنی ہمت کے سہارے کیونکہ بارہ میل کے قریب وہ پیدل چلے تھے۔

ایسے حادثات دلّی کی تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوئے تھے۔ جہاں اس بدامنی سے انارکی کا خطرہ تھا وہیں تھوڑا سا اطمینان بھی تھا کہ صدیوں سے ٹھوکرے کھانے والی اور پاؤں تلے روندی جانے والی دلّی آخر کار بیدار ہوگئی تھی۔

●●

(۸)

کرفیو کی ساعتیں

جیسے تیسے دوسری جنگ عظیم ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔ جرمنی کے ساتھ دو تین ماہ بعد جاپان بھی حوصلہ ہار بیٹھا۔ سرکار نے چھ ماہ پہلے سے فتح کے جشن کا شاندار پروگرام بنا رکھا تھا۔ کاغذی کاروائی سبھی سرکاری دفتروں میں ہو چکی تھی۔ پر جب لڑائی بند ہوئی تو لکھا ہوا پروگرام سبھی بھول گئے۔ بس ایک ہی بات یاد رہ گئی۔ دفتروں اور اسکولوں میں ایک دن کی چھٹی منائی گئی۔ شاید کہیں کہیں کسی عوامی تنظیم کے پیسہ سے مٹھائی بھی تقسیم کی گئی ہوگی۔ لیکن یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ہندوستان کی عام جنتا جنگ کے نتیجہ سے بے نیاز اور لاپرواہ تھی۔ تاہم کسی کو جرمنی یا جاپان سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ جنگ کا سارا گورکھ دھندا ہمارے لئے بناوٹی تھا۔ اس لئے نتیجہ میں اس کا انجام بھی بناوٹی۔ پبلسٹی بناوٹی۔ ہندوستان کا جنگ میں شریک ہونا بناوٹی۔ اور اس کا انجام بھی بناوٹی۔ پھر عوام کی لاپرواہی پر تعجب کس طرح ہو!

ہندوستان کی دلچسپی اب اس بات میں تھی کہ فاتح برطانیہ اب ہمارے ساتھ

کس طرح کا برتاؤ کرتا ہے۔ لارڈ ویول لندن گئے ہوئے تھے۔ جہاں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں غور فکر ہو رہا تھا۔ جون ۱۹۴۵ء کے آخری ہفتہ میں وائسرائے دلّی پہونچے۔ آتے ہی انھوں نے کانگریسی رہنماؤں کو آزاد کر دیا۔ اور شملہ میں تمام سیاسی رہنماؤں کی کانفرنس کا انتظام کیا۔ کانفرنس میں خوب رونق رہی۔ مگر مسلم لیگ کی ضد کی وجہ سے گتھی الجھتی ہی گئی۔ کانگریس کی سو دلیلوں کا جواب مسلم لیگ کے پاس ایک ہی تھا "پاکستان"۔ کانفرنس ختم ہو گئی۔ ملک میں تناؤ اور بڑھ گیا۔

ادھر برطانیہ میں ایک بہت اہم اور سنجیدہ تبدیلی عمل میں آئی۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں جو عام چناؤ ہوئے۔ ان میں قدامت پرست پارٹی کی زبردست ہار ہوئی۔ اور مسٹر اٹیلی کی رہنمائی میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آئی۔ ہندوستان کو اس تبدیلی میں امید کی ایک کرن نظر آئی اگرچہ بہت سے تجربہ کار سیاستداں سبھی انگریزوں کو ایک جیسا سمجھتے تھے اور "چور چور ماموں زاد بھائی" کی کہاوت کے قائل تھے۔ اٹیلی سرکار نے عہدہ سنبھالتے ہی ہندوستان کے معاملے میں دلچسپی ظاہر کی۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد بھی گفتگو چلتی رہی۔

اچانک لندن سے یہ اعلان کیا گیا کہ ایک مقررہ مدت کے اندر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے۔ اور حکومت کی ذمہ داری ہندوستانیوں کو سونپ دی جائے گی۔ چاہے کانگریس لیگ میں سمجھوتہ ہو یا نہ ہو۔ اس اعلان نے ہندوستان کی پوری صورت حال کو بدل کر رکھ دیا۔ نیک خیالات رکھنے والے تو تعمیری ڈھنگ سے آنے والی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی سوچنے لگے۔ اور موقع پرست اپنے ذاتی مفاد اور خود غرضی کے مواقع کے لئے کوشاں ہو گئے۔

اخباروں میں خوب نوک جھوک چلی۔ دھواں دھار تقریروں کی جیسے جھڑی سی لگ گئی۔ اچانک حادثوں نے پھر نیا موڑ لیا۔ اگست ۱۹۴۶ء کے کلکتہ کے بھیانک فسادات کی خبر نے

نے کناٹ پلیس اور چاندنی چوک دونوں کو چوکنا کر دیا۔ ایسا بھیانک فرقہ وارانہ فساد اس سے پہلے
کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک ہفتہ میں دس ہزار سے زیادہ افراد مارے گئے۔

کلکتہ کے فسادات کو بہار میں دہرایا گیا۔ جیسے انسان کچھ عرصہ کیلئے انسانیت سے اکتا کر جانور بن گیا تھا۔ سارا ملک ان فسادات سے کانپ اٹھا۔ نہ جانے اب کس صوبہ کی باری آئے۔ کہاں مار پٹائی ہو۔ سبھی لوگ یہ سوچا کرتے تھے۔ دلّی کے لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

انھیں حادثوں کی وجہ سے ۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء میں دلّی کے لوگوں نے ایک نیا موسم دیکھا۔ دوسرے موسموں کے مقابلہ میں یہ موسم پورے ایک سال تک چلا۔ یہ تھی کرفیو کی لعنت۔ موسم بدلنے سے ہمارے رہن سہن۔ کھانے خوراک۔ لباس وغیرہ میں اتنی تبدیلی نہیں ہوتی جتنی کرفیو کی وجہ سے ہوئی۔ کوئی چھ ماہ نومبر ۱۹۴۶ء سے اپریل ۱۹۴۷ء تک کرفیو دس یا بارہ گھنٹہ کا رہا۔ رات کے چھ یا آٹھ بجے سے زیادہ تر صبح چھ بجے تک۔

شروع میں کرفیو کافی گراں گذرا۔ ایک تو دلّی پر ویسے ہی خدا کی مہربانی ہے چہل قدمی کو چھوڑ کر یہاں اوسط درجہ کے لوگوں کے لئے تفریح کا کوئی ذریعہ نہیں۔ کرفیو نے چہل قدمی کو بھی جرائم کی فہرست میں شامل کر دیا۔ آنکھ بچا کر کچھ دنوں تک میں تھوڑا بہت کرفیو کے زمانہ میں بھی گھوما مگر جلدی ہی عقل آگئی۔ پڑوس کے تین چار نوجوان پوسا روڈ کی ٹھنڈی ہوا کھاتے پکڑے گئے تھے۔ دو دن حوالات میں جوان کی مٹی خراب ہوئی۔ اس کا حال سنکر میں زندگی میں کبھی بھی ہوا خوری نہ کرنے کی قسم کھانے کو تیار ہو گیا۔

دھیرے دھیرے کرفیو ہمارے خون میں سما گیا۔ پانچ بجے شام کو ہی لوگ رات تصور کرنے لگے۔ کہاوتیں اور محاورے تک بدل گئے۔ سورج کو چھپتا دیکھ کر اب کوئی

یہ نہ کہتا تھا کہ دن ڈھل رہا ہے۔ بلکہ یہ کہتا کہ رات سر پر آ گئی۔ دفتروں سے پانچ بجے ہی پیچھا چھڑانے کا اچھا بہانہ ہاتھ آیا۔ سب کو چھ بجے سے پہلے گھر پہونچنا ہوتا تھا۔

بیویوں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا۔ کہاں تو بہت سی بیویوں کو کھانا کبھی شوہر کا انتظار کرتے کرتے اکیلے ہی کھالینا پڑتا تھا۔ اور کہاں اب شام کو چائے بھی میاں بیوی محبت کے ساتھ اکٹھے پینے لگے۔ بہت سی بیویاں کرفیو کو پچھلے جنم کے نیک کاموں کا پھل ماننے لگیں تھیں۔ میری بیوی تو آجتک کہتی ہے: "کتنے اچھے تھے وہ دن جب سارا خاندان ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پیتا تھا۔ اب پانچ بجے سے تمہاری راہ دیکھنے لگتی ہوں۔ کبھی وقت پر نہیں آتے۔ کلّو بیچارہ اب تمہارا انتظار کرتے کرتے سو جاتا ہے۔"

کرفیو کی بات چیت اکثر اب بھی ہمارے گھر میں ہوتی ہے۔ شریمتی جی کئی بار پوچھ چکی ہیں: "کیا ہندو مسلم فسادات کے بغیر ہی کرفیو نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ تو اچھا ہے کہ اب ہم آزاد ہیں۔ اور جھگڑے نہ ہونے پر کرفیو کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ میرا بس چلے تو میں مہینے میں کم سے کم ایک ہفتہ تو دس گھنٹے کا کرفیو لازمی کر دوں۔"

میں بھی شریمتی جی سے متفق ہوں۔ مہینہ میں ایک ہفتہ کا کرفیو مجھے منظور ہے۔ اس سے اور کچھ نہیں زندگی کی بےکیفی کا ایک سلسلہ تو ٹوٹ جائے گا۔ کبھی کبھی تو لوگ گھر کی طرف دوڑتے دکھائی دینگے۔ آجکل جب دیکھو جہاں دیکھو پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیٹی بجاتے بہت سے لوگ بیکار گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

کرفیو کی بات کرتے کرتے مجھے دسمبر ۱۹۴۶ء کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک دن شام کو میرے یہاں چار بجے کیلاش جی آ گئے۔ دفتر کی اس دن چھٹی تھی۔ کیلاش کے اصرار پر ہم دونوں ایک دوست سے ملنے کناٹ پلیس چل دیئے۔ سیدھے شیلندر جی کے یہاں پہونچے۔

شیلندر بڑے تپاک سے ملے۔ سب لوگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آدھ گھنٹہ گفتگو کے بعد کیلاش نے کہا۔ "بھئی شیلندر کچھ اور نہیں۔ کم سے کم چائے کا تو کوئی انتظام کرو۔" شیلندر فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے۔ اور چائے وغیرہ بنوانے لگے۔ میں نے کیلاش کو ڈانٹا یہ کتنی بھدی بات ہے زبردستی کسی سے چائے پی رہے ہو۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ کیلاش کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بولے: "شیلندر کے یہاں چائے نہیں پی جائے گی۔ آج جناب بیل دوہا جائے گا۔ یہ حضرت ہمیشہ دوستوں کے دستر خوان پر ہی شیر رہتے ہیں۔ اپنے یہاں کسی کو کھلانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ آج دیکھو کیا ہوتا ہے۔ چائے ختم ہونے تک چھ بج چکے گیں۔ ہم یہیں ڈٹے رہیں گے۔ اتنے میں کرفیو کا وقت ہو جائے گا۔ پھر تو ہمیں شیلندر سے بلا جھجک کھانے اور رات کو یہیں سونے کے لئے کہنا پڑے گا۔ اب کل سویرے گھر چلیں گے۔ بھابھی جی کو فون کر دیں گے۔"

ہوا بھی یہی۔ شیلندر کی بری گت بنی۔ وہ گھڑی کی طرف تو بار بار دیکھتے پر ہمیں گھر سے جانے کو کیسے کہہ سکتے تھے۔ سات بجے اسکیم کے مطابق کیلاش نے چلانا شروع کیا۔ قیامت ہو گئی۔ کرفیو میں اب ہم لوگ کیسے جائیں گے۔ مجھ پر تو پتاجی بہت بگڑیں گے۔ اچھا۔ قسمت کی بات ہے دانے دانے پر مہر لگی ہوتی ہے۔ آج بھائی شیلندر ہمیں تمہارے یہاں کھانا کھانا اور آرام کرنا تھا۔ اب تو گھر والوں کے کل ہی دیدار ہوں گے۔"

رات بھر وہیں آرام کیا گیا۔ شیلندر لیچڑ ضرور تھے۔ مگر وہ دلچسپ ادیب بھی تھے۔ چائے اور کھانے پر جو خرچ ہوا ہوگا۔ انھوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ آدھی رات تک شعر و ادب کی باتیں ہوتی رہیں۔ اگلے دن صبح جب ہم جانے لگے تو شیلندر نے ہمیں ایک خوبصورت نظم سنائی۔ اس کا عنوان تھا: "کرفیو کی ساعتیں"۔

(۹)

ایک امریکن سے ملاقات

ایک دن مجھے کسی ضروری کام سے ٹھیک پانچ بجے کناٹ پلیس پہونچنا تھا۔ دفتر میں ہی پونے پانچ بج گئے۔ بائیسکل اٹھا میں ایکدم بھاگا۔ بہت تیزی سے جا رہا تھا۔ ریگل کی طرف سے ایک امریکی سپاہی ہاتھ میں سائیکل تھامے دھیرے دھیرے سندھیا ہاؤس کی طرف جا رہا تھا۔ دور سے میں اس کو دیکھ رہا تھا۔ پر نہ جانے کیا ہوا میں زور سے اس کی سائیکل سے ٹکرا گیا۔ اس کی سائیکل کا پہیہ ایسے مڑ گیا جیسے روٹی مڑ جاتی ہے۔ امریکی بیچارہ دھکا کھا کر ایک طرف گر پڑا۔ میں گھبرا کر فوراً سائیکل سے اترا۔ اور سیدھا امریکن کی طرف لپکا۔ اسے اٹھایا اور پوچھا:۔ "چوٹ تو نہیں لگی؟ مجھے افسوس ہے کہ میری لاپروائی سے یہ حادثہ ہوا۔"

امریکن نے اٹھکر کپڑے جھاڑے اور میری طرف دیکھا۔ پر وہ بولا کچھ نہیں۔ میں پھر بولا۔" مجھے اس حادثہ کا بڑا افسوس ہے۔" کچھ دیر خاموش رہ کر امریکن نے اپنی سائیکل کی طرف دیکھا اور پھر مجھ پر نگاہ ڈالی اور انگوٹھے سے سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"مگر اس کا کیا ہوگا" میں نے کہا۔ اس کی فکر مت کیجئے اس کی مرمت میں کرائے دیتا ہوں آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟ پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا۔"

دو منٹ چپ رہ کر امریکی پھر بولا:۔ "مرمت کیسے ہوگی پہلے تو 'ڈی' (مڑی ہوئی) بنی پڑی ہے۔ اسے لیجایا کیسے جائے گا۔"

میں سمجھ گیا۔ میں نے پاس سے جاتے ہوئے تانگے کو روکا۔ اس میں ٹوٹی ہوئی سائیکل رکھی۔ اور امریکن سے بیٹھنے کو کہا اس نے پل بھر کچھ سوچا اور پھر کہا:۔ "نہیں تانگے میں آپ بیٹھے میں آپ کی سائیکل پر چلوں گا۔"

میں دل میں بہت ہنسا۔ جیسے ہی میں تانگے میں آگے کی سیٹ پر بیٹھا تانگہ چلا۔ پیچھے پیچھے میری سائیکل پر سوار مونگ پھلی چباتا امریکن ساتھ ہولیا۔ جو ضروری کام مجھے کناٹ پلیس لایا تھا وہ میں بالکل بھول چکا تھا۔ اب مجھے فکر امریکن اور اس کی سائیکل کی تھی۔ میں تمام حادثہ پر غور کرنے لگا۔ اپنے اوپر جو غصہ مجھے آیا تھا۔ وہ اب ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ میں امریکن کی فطرت و مزاج کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ آدمی بھی کیسا عجیب ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ اپنی چوٹ وغیرہ کے بارے میں کچھ کہنے کو تیار نہیں۔ صرف سائیکل کی فکر میں ڈوبا ہے۔ اس فکر نے ہی شاید اسے اسقدر بیقرار کر دیا ہے کہ وہ کسی پر بھی اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اسی لئے تو میری سائیکل پر خود سوار ہوا ہے۔ اور مجھے تانگہ میں بٹھایا ہے۔

اوڈین کے پاس پہونچتے ہی میں نے تانگہ کو روکا۔ اور ساتھ والی سائیکل کی دکان سے ایک آدمی کو بلایا۔ اس نے سائیکل تانگے سے اتاری اور دیکھکر کہا۔ ٹھیک ہو جائیگی۔ پر کل ملے گی۔ میں نے اسے اصرار کے ساتھ کہا کہ مرمت بہترین ہونی چاہیئے۔ دام چاہے جو لینا۔ ایسا نہ ہو کوئی کمی رہ جائے۔ امریکن کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا:۔ "سب ٹھیک

ہو جائے گا۔ آپ کی سائیکل کل دو بجے تیار ہو جائے گی۔ سچ بتائیے آپ کے کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟

امریکن تھوڑا مسکرایا اور مونگ پھلی چھیلتے ہوئے بولا: "اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ نے اس دکاندار سے جو باتیں کی ہیں ذرا اس کا انگریزی میں ترجمہ تو کر دیں تاکہ میں بھی سمجھ لوں۔"

چوٹ کی بات پھر نظر انداز کر دی گئی تھی۔ میں بڑا حیران ہوا۔ خیر میں نے امریکن کو ساری بات سمجھا دی۔ مرمت کے گیارہ روپیہ میں نے اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ اب وہ مطمئن ہو گیا۔ اور میری سائیکل مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "شکریہ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا" میں نے جواب دیا: "آپ کو گھومنے پھرنے میں تکلیف ہو گی۔ اس لئے کل تک میری سائیکل آپ ہی رکھ لیں مجھے اپنا پتہ دیجئے۔ میں آکر بعد میں اپنی سائیکل لیجاؤں گا۔"

اب امریکن کچھ پسیجتا ہوا دکھائی دیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنسا اور بولا: "آپ بہت سمجھدار اور خوش اخلاق معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں میں آپ کو ضرورت سے زیادہ تو تکلیف نہیں دے رہا ہوں؟ میں پارلیمنٹ اسٹریٹ پر وینگرز فلیٹس میں رہتا ہوں۔ میرے کمرہ کا نمبر ۱۵ ہے اور میرا نام ہے ہنری جے ہمفرے۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو آیئے چلے چلیں کچھ دیر بیٹھیں گے۔ کیا کافی کا پیالہ پیجئے گا؟"

اس قدر تکلیف دہ حادثہ کا اتنا خوشگوار انجام ہونے کی خوشی میں میں نے ان کا دعوت نامہ منظور کر لیا۔ ہمفرے اور میں دونوں وینگرز فلیٹس کی طرف چل دیئے۔ وہاں پہونچکر ہمفرے نے اپنے کمرہ کا تالا کھولا۔ اور مجھے اندر بیٹھا کر خود باہر چلا گیا۔ میں سمجھا کسی سے کافی کے لئے کہنے گیا ہے۔ پورے دس منٹ بعد وہ واپس آیا۔ کچھ لنگڑاتا ہوا سا چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی شیشی تھی جس میں کالی سی دوائی تھی۔ اور ایک روئی کا بنڈل تھا۔

شرمندگی کی وجہ سے میرا منہ لال ہو گیا۔ ایکدم صدمہ سے اٹھکر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور اسے آرام سے صوفہ پر بٹھا دیا۔ افسردہ آواز میں میں نے کہا: "مسٹر ہمفرے آپ کو کافی چوٹ آئی ہے۔ میرے بار بار پوچھنے پر نہ جانے آپ نے کیوں کچھ نہیں بتلایا۔ اب تو بتلائیے چوٹ کہاں لگی ہے؟"

اپنی دائیں ٹانگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہمفرے نے کہا: "معمولی سی کھرونچ یہاں آئی ہے۔ گوشت چھل گیا ہے۔ کچھ دیر ٹنکچر لگا کر سینکدینے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بتانے کی آپ کو کیا بات تھی۔ اس وقت سب سے بڑا سوال سائیکل کا تھا۔ دوا تو یہاں ڈسپنسری سے مل ہی جاتی سائیکل تو مرمت ہی کروانے سے ٹھیک ہونی تھی۔ اسی لئے میں پہلے سائیکل کے مسئلہ کو حل کر لینا چاہتا تھا۔ چوٹ تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

ایک ایک مٹھی مونگ پھلی کھانے کے بعد ہم نے گرم کافی پی۔ ہمفرے نے مجھ سے تعارف چاہا۔ اب ہم ایک دوسرے کو جان گئے تھے۔ بہت سی اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ آٹھ بجے میں نے جانے کی اجازت چاہی۔ ہمفرے مجھے سڑک پر چھوڑنے آیا۔ ہاتھ ملاتے وقت وہ بولا: "مسٹر ہیمنت کیا آپ ایک اوسط ہندوستانی ہیں؟ یا کیا میں یہ سمجھوں کہ کسی بھی عام ہندوستانی کا ایسا ہی برتاؤ ہوگا جیسا آپ کا؟"

"یہ تو بڑا پیچیدہ سوال ہے" میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا: "کبھی پھر ملیں گے تو اس سلسلہ میں بات کریں گے۔" ہمفرے نے میرے گھر آنے کا وعدہ کیا اور پھر ہم رخصت ہو گئے۔

یہ واقعہ ۱۹۴۳ء کا ہے۔ اس دن دس ہزار سے زیادہ امریکن دلّی میں تھے۔ شام کے وقت جہاں دیکھو یہی لوگ دکھائی دیتے تھے۔ انھیں سوائے گھومنے کے اور کوئی کام بھی نہیں تھا۔ ریگل۔ پلازہ۔ اوڈین سینما گھروں کے سامنے ہر روز تیس چالیس امریکن کھڑے رہتے تھے۔

جو ٹکٹ لے کر اندر چلے جاتے وہ تو خوش ہوتے ہی مگر جو کسی وجہ سے باہر رہ جاتے تھے وہ بھی کچھ کم خوش دکھائی نہیں دیتے تھے۔ خالی وقت میں اکثر ان کا ایک ہی کام ہوتا تھا وہ تھا مونگ پھلی چبانا۔

جنگ کے دوران دلّی میں جو غیر معمولی رونق ہو گئی تھی (خدا دلّی کو نظر بد سے بچائے) امریکی لوگوں کا مقام اس میں سب سے نمایاں تھا۔ کچھ دنوں تک یہاں کے دکانداروں۔ تانگے والوں ٹیکسی والوں۔ ہوٹل والوں وغیرہ کے خوب مزے رہے۔ چیزوں کے دام ان دنوں رُپیے ہی ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی طرح تھے دکاندار جو جی میں آتا مانگ بیٹھتے تھے۔ ہم لوگ تو سودا کرنے کے عادی ہیں۔ شروع میں امریکن اس کے عادی نہیں تھے۔ ہمفرے نے مجھے بتلایا جب وہ مارچ کے مہینہ میں دلّی آیا اس نے بوٹ پالش کے لئے ہر روز آٹھ آنے دیئے۔ اور کئی بار پان کا بیڑا چار آنے کا خریدا۔ بہت سے امریکنوں کی طرح ہمفرے کو بھی پان اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھی تانگے والے بھی ان سے خوب پیسے جھاڑتے تھے۔ مگر امریکن کاروبار میں بہت ہوشیار ہوتے ہیں انھوں نے زیادہ دن تک مار نہیں کھائی۔ بعد میں تو انھوں نے سبھی چیزوں کے ٹھیک داموں کا پتہ لگا لیا۔ اور یہاں کے ناپ تول کو خوب سمجھ گئے تھے۔

ہمفرے کے ذریعہ میری کئی اور امریکنوں سے ملاقات ہوئی ہمفرے میرے ساتھ دلّی میں کافی گھوما۔ ایک دن میری سائیکل کچھ خراب تھی۔ ہمارا خیال ہمایوں کا مقبرہ دیکھنے کا تھا۔ جانا ضروری تھا۔ اس لئے میں نے کہا تانگے سے چلنا مناسب ہوگا۔ ہمفرے نے سیٹی بجاتے ہوئے ہاں کہا۔ دونوں تانگے میں سوار ہو چل دیئے۔ راستہ میں ہمفرے نے کیلے اور سنگترے خریدے جو ہم دونوں نے کھائے۔ تانگے سے اترتے ہی کچھ مونگ پھلی خریدی گئی۔ جس سے میں نے اور ہمفرے نے اپنی اپنی جیبیں بھر لیں۔ ہم لوگ دن بھر گھومے۔ ہمفرے نے۔ جو امریکی فوج میں

اچھا فوٹو گرافر رہ چکا تھا کئی اچھے فوٹو کھینچے۔

شام کو اسی تانگے میں ہم واپس آ گئے۔ ونیگرس فلیٹ میں ہی ہم نے کافی پی۔ جب میں اٹھکر چلنے لگا۔ ہمفرے کوئی بھولی ہوئی بات یاد کرتے ہوئے اچانک بولا: "ارے حساب تو کیا ہی نہیں"۔ دو منٹ پنسل سے کچھ لکھ کر پھر بولا "نو روپیہ بارہ آنے۔ اس میں آپ کا حصہ ہے چار روپیہ چودہ آنے۔ یہ آپ مجھے دیدیجئے"۔

میں جانتا ہوا بھی اس فرض کو پورا کرنا بھول گیا تھا۔ لیکن پانچ روپے کا نوٹ دے اور دو آنی اپنی جیب میں ڈال میں ہمفرے سے ہاتھ ملا کر گھر واپس آگیا۔ امریکن حساب کے پکے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دوستی کے جذبے سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کا اخلاق ہمارے اخلاق سے کچھ مختلف ہے۔ حساب کتاب کے پکے ہوتے ہوئے بھی وہ اچھے دوست ہی نہیں بہترین مہمان نواز بھی ہوتے ہیں۔ ہمارا اخلاق ذرا نرم و نازک ہے اور وہ ریاضی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ میرا ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ خیال ہے کہ اخلاق میں نرمی کا زیادہ ہونا مفید نہیں۔ یہ تو جتنا سخت ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ ریاضی ہی نہیں بلکہ ہاتھا پائی کا بار بھی اگر اخلاق اٹھا سکے تو برا نہ ہوگا۔

آج تین برس ہو چکے ہمفرے کی کوئی خبر نہیں ملی وہ ۱۹۴۵ء ہی میں اپنے شہر بوسٹن واپس جا پہونچا تھا۔ دو چار خط بھی اس کے آئے۔ اکثر ہم گھر پر ہی اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ میں تو ہمفرے کو ہزار کوشش کے باوجود بھی فراموش نہیں کر پاتا۔ کیونکہ وہ مجھے فوٹو گرافی کی مہنگی علت لگا گیا۔ اور میرے بچوں کو چیونگ گم چوسنے کا چسکہ۔

●●

(۱۰)

"باغی" رہنما، وزارت کے عہدہ پر

بغاوت اور حب الوطنی ان دونوں الفاظ کا مطلب ایک ہی ہے۔ ان میں اگر کوئی فرق ہوتا ہے تو صرف ملک اور زمانہ کی وجہ سے۔ دراصل بغاوت اور حب الوطنی ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ شاید ہی کوئی ایک محب وطن ہو جو اپنی زندگی میں کبھی باغی نہ سمجھا گیا ہو۔ ایسا بدقسمت باغی بھی آسانی سے نہیں ملے گا جسے کم از کم ایکبار محب وطن کہلانے کی خوش نصیبی حاصل نہ ہوئی ہو۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ہر ایک باغی حب وطنی کے جذبات لئے ہوتا ہے۔ اور ہر محب وطن کی مضبوطی کی بنیاد بغاوت کی قوت پر ہوتی ہے۔ انگریزی کے مشہور ادیب اور مفکر سی۔ آئی۔ ایم جوڈ نے ان الفاظ کی تشریح بڑے ہی دلچسپ طریقے سے کی ہے :۔ "محب وطن کامیاب باغی ہے اور باغی ناکام محب وطن"۔

اس بیان میں کتنی سچائی ہے اور کتنی آسانی سے باغی محب وطن میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ یہ جادو بھرا کھیل بھی دلّی والوں نے دل بھر کر دیکھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ سردار بلبھ بھائی پٹیل

ڈاکٹر راجندر پرساد۔ جگجیون رام اور دوسرے کانگریسی رہنما جو سالوں سے باغیوں کی پہلی صف میں گنے جاتے تھے۔ اور اسی وجہ سے جنگ چھڑنے کے بعد جیل کے اندر زیادہ اور جیل کے باہر کم رہے تھے۔ ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو نئی دلی میں وائسرائے کابینہ کی ممبری کے لئے حلف اٹھانے آئے۔ اس دیش کی تاریخ میں پہلی بار عہدہ داروں کا حلف وفاداری اٹھانا عوام کی دلچسپی کا مرکز بنا۔ اس سے پہلے بھی اعلیٰ افسر اپنے عہدہ کی ذمہ داری لینے سے پہلے حلف وفاداری اٹھاتے ہی ہوں گے۔ مگر اس سے عوام کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جب ۲ر ستمبر کو کانگریسی رہنما حلف اٹھانے وائسرائے ہاؤس کی طرف بڑھے۔ تو سکرٹریٹ کی سڑکوں پر ہزاروں آدمی ان کا استقبال کرنے کیلئے موجود تھے۔

وہ سرکاری ملازم جو سدا سے آئی سی ایس کے لوگوں کے ہی وفادار رہے ہیں اور جنہوں نے ان کی خدمت وچاکری میں ہی زندگی کی بھلائی محسوس کی ہے۔ اس انوکھے نظارہ کو دیکھ کر حیران وششدر تھے۔ تمام ہی ملازم ایک سے نہیں تھے۔ ان میں بھی ایک طبقہ ایسا تھا جو آزادی کے نام پر فائلوں اور رنگ برنگے کاغذوں کو پھینک کھلی فضا میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگانے کو سدا تیار رہتا تھا۔ اس طبقہ کے زیادہ تر لوگ جنگ کی افراتفری میں بھرتی ہوئے تھے۔ اسی لئے وہ جونیئر تھے۔ ان کے اوپر جن لوگوں کا انکش تھا وہ منجھے ہوئے افسر اور سپرنٹنڈنٹ تھے جو دفتری زندگی کی دوڑ میں کافی آگے نکل چکے تھے۔ اور جو نوکری کے داؤ پر اپنی ساری دولت لگا بیٹھے تھے۔ یہ لوگ تھے سنجیدہ۔ سینئر وفادار حکم ماننے والے اور ہر تبدیلی کے خلاف۔ بھارت سرکار کی چابی دراصل انھیں لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ جب رہنماؤں کی کاریں اونچی سڑک پر سے ہوکر وائسرائے بھون گئیں۔ جونیئر طبقے کے ملازمین نے نعرے لگاکر عوام کا ساتھ دیا۔ سینئر طبقہ میں سے دو چار باہر نکلے اور چشمے اوپر ماتھے پر چڑھا لیا نیچے ناک پر کر دور سے نیتاؤں کو صرف دیکھ کر سنجیدہ چہرے بنائے اپنے اپنے کمروں میں جا بیٹھے۔

ہندوستان کی طویل پچاس سالہ جنگ آزادی میں یہ واقعہ دراصل نہ صرف انوکھا تھا بلکہ بے مثال تھا۔ بھلا کہاں تو یہ لوگ اپنی تقریروں اور بیانات میں سرکار کی کڑی نکتہ چینی کرتے تھے اور کہاں آج یہ خود حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے جا رہے تھے۔ اس سے بڑی تبدیلی اور کیا ہو سکتی تھی۔ سیاست کے سلجھے ہوئے اور سمجھدار طالب علم جان گئے تھے کہ انگلینڈ میں لیبر پارٹی کے برسراقتدار آجانے کا یہ پہلا نتیجہ ہے۔ فضا میں اس سے بھی بڑی تبدیلی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ آزادی کی خوشبو سے پوری فضا مہکی ہوئی تھی۔ مسلم لیگ کی قدامت پرستی کی پالیسی کے باوجود لوگوں کو اب اندازہ ہونے لگا تھا کہ ملک کے افق پر آزادی کا سورج طلوع ہونے جا رہا ہے۔ زمانہ کروٹ بدلتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اسی دن شام کو حلف وفاداری اٹھانے کے بعد وزیروں نے پریس کانفرنس میں تقریریں کیں۔ ان کی طرف سے ان کے رہنما پنڈت نہرو نے ہندی میں تقریر کی۔ یہ اور بھی نرالی بات رہی۔ سرکاری پریس کانفرنس میں ہندی میں بات چیت؛ بہتوں نے ناک بھنوں سکیڑی۔ پر گردش ایام کو کون روک سکتا تھا۔ ہندوستانی اور غیر ملکی اخبار نویسوں نے اس روز سمجھ لیا تھا کہ اب اس ملک میں انگریز اور انگریزی زیادہ دن باقی رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔

راجدھانی میں سب طرف سنسنی تھی۔ جوش تھا۔ سیاسی حلقوں میں غیر معمولی ہماہمی تھی۔ یہ بات نہیں کہ وزارتوں پر ہندوستانی رہنماؤں کا تقرر ہو جانے سے عوام مطمئن ہو گئے تھے۔ عوام کو اپنے لیڈروں کی سمجھداری اور ہوشیاری پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک بار سکریٹریٹ میں ان کے گھسنے کی دیر ہے پھر حکومت کی مشینری کی کایا ہی پلٹ جائے گی۔ یہ یقین آخر صحیح ثابت ہوا۔

سرکاری حلقوں میں ہلچل کم نہیں تھی۔ جہاں دیکھو اس واقعہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اوپر سے تو سبھی خوش دکھائی دیتے تھے۔ پر اندر سے کچھ لوگ شک و شبہ میں تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کے افسر

سے میری بات ہوئی۔ وہ ۲۳ سال نوکری کے پورے کر چکے تھے۔ جنگ کی ابتدا ہی میں افسر ہوئے تھے۔ کام میں بڑے ہوشیار تھے۔ اور ذمہ داری کا احساس تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی سنجیدگی سے تو مجھے کبھی کبھی احساس ہوتا تھا جیسے سکریٹریٹ کا بوجھ انھیں کے سر پر ہے۔ جب میں نے نیتاؤں کے حلف اٹھانے پر ان کو مبارکباد دی تو وہ کچھ چکر میں پڑ گئے کہ وہ اس مبارکباد کا جواب دیں تو کیا دیں۔ سر کھجلاتے ہوئے بولے: "ہاں بھائی۔ ایشور نے ملک کی عزت تو رکھ لی ہے۔ دیکھو اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ یہ لوگ تو مہینوں میں ہی بغاوت کے بیج بو ڈالیں گے۔ اب انگریز کی خیر نہیں۔ کیا بتائیں۔ مصیبت ہم جیسوں کی ہے۔ ہمیں اب شکار بنایا جائے گا۔ اس سال رائے صاحب کا خطاب جو مل گیا وہ ہمیں اور بھی لے کر ڈوبے گا۔ ہم جیسوں کا قصور کوئی ہو نہ ہو۔ جی حضوری کے جرم میں ہی ہمیں رگڑ دیا جا سکتا ہے۔"

"اجی کیوں پاگل ہوئے ہو" میں نے دوستانہ جذبہ کے ساتھ کہا: "بھلا ان لوگوں کو اور کام تھوڑا ہی ہے جو رگڑنے کی بھوک مٹانے کے لئے آپ جیسوں کی فہرس بناتے پھریں گے۔ آپ اور ہم تو کولھوں کے بیل ہیں جنھیں چلنے سے مطلب۔ گھانی میں چاہے سرسوں ہو یا مونگ پھلی یا بادام۔"

میں بات بھی پوری نہ کر پایا تھا کہ رائے صاحب کھسک گئے۔ اسی طرح کچھ لوگ جان بوجھ کر تخیل پر دباؤ ڈالکر طرح طرح شکوک و شبہات کا شکار تھے۔ زیادہ تر خود غرضی، تنگ نظری اور خوف کی وجہ سے اس عظیم تبدیلی کی اہمیت کو سمجھنے میں قاصر تھے۔

خوش قسمتی سے اس تبدیلی کا اثر چند روز میں ہی رنگ لایا۔ سکریٹریٹ کا باہری رنگ روپ اور اندرونی طرز فکر بدلتے سے دکھائی دینے لگے۔ ملازمین کی پوشاک پر سب سے زیادہ اثر دکھائی دینے لگا۔ مجھے یاد ہے ایک دن میرے ایک دوست کو اچکن پہنکر دفتر آنے پر

ڈانٹ پڑی تھی۔ اب لوگ بے دھڑک دھوتی اور کرتا پہنکر آنے لگے۔ گاندھی ٹوپیوں کا تو موسم ہی آگیا۔

یہ سب آثار مجھے نیک فال معلوم ہوئے۔ میں نے سوچا کچھ ہو نہ ہو سرکاری ملازمین کو کوئی چلنے گھڑے تو نہ کہہ سکے گا۔

(۱۱)

آزادی کا نزول

ماضی میں دلی کی بہت سی تقریبات بہت سے تہوار دیکھے ہیں۔ قدیم دور میں بڑے بڑے چکرورتی عالمگیر شہنشاہوں کے راج تلک یہاں ہوئے۔ دشمنوں کو ہرا کر بہت سے راجا جب دلّی میں داخل ہوئے تو عوام نے ان کا شاندار خیر مقدم کیا۔ ایسے موقعوں پر دلّی نے بڑے جوش و خروش۔ امنگ و خوشی کی گھڑیاں دیکھی ہوں گی۔ ایسی گھڑیاں جن میں سورج غروب ہونے اور طلوع ہونے کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اور انسان عارضی طور پہ زمان و مقام کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ لیکن ماضی کی وہ سبھی تقریبات اس عظیم الشان جشن کے آگے پھیکی پڑ گئیں جو دلّی کے لوگوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو دیکھا۔

اس رات دلّی میں آزادی ملی۔ ٹھیک آدھی رات کے وقت ۱۵ اگست کے دن نے جب آنکھیں کھولیں تو لاکھوں عورتوں اور مردوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے گنگا کی طرح آزادی آسمان سے زمین پر اتر رہی ہو۔ زمین پر روشنی کی آمد بھی اسی طرح ہوتی ہو گی۔ اسمبلی ہال میں اس وقت میں کھڑا سوچنے لگا کہ مستقبل میں کوئی شاعر "آزادی کی آمد" نام سے نظم ضرور لکھے گا۔

اگر سنسکرت اور ہندی کے شعراء گنگا اور اروشی کے خیالی نزول پر نظمیں لکھ سکتے ہیں تو بلا شک آزادی کی آمد پر بھی بہت سی نظمیں لکھی جائیں گی۔ میں سوچنے لگا آنے والے شاعر کے خیالات کا رخ کیا ہوگا۔ جگناتھ پرشاد رتناکر نے اپنے شعروں میں بھارتیندر ہریشچندر نے "گنگا کی شوبھا" نظم میں ہمگری سے جس طرح گنگا کے نکلنے کا بیان کیا ہے اسی طرح ہمارا آنے والا شاعر بھی آزادی کی صبح کا منظر استعاروں و تشبیہوں میں کھینچنا چاہے گا۔ بھارتیندر کا کام تو مہابھارت میں بیان کردہ حادثات و واقعات کی وجہ سے آسان تھا۔

مگر آزادی کی تصویر تو شاعر کو اپنی فہم و سمجھ سے ہی کھینچنی ہے۔ اسے لازمی طور پر وشنو کے قدم کی جگہ آزادی کی صبح کو مہاتما گاندھی کی پیشانی سے جوڑنا ہوگا۔ تصویر کو مکمل کرنے کے لئے اسے جواہر لال۔ پٹیل۔ راجیندر بابو۔ راجگوپال آچاریہ اور دوسری عظیم شخصیتوں کا سہارا لینا ہوگا۔

خیالات کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ پیچھے سے ہجوم کا ایک زور کا ریلا آیا کہ ہزاروں افراد ایک دوسرے کے اوپر گر پڑے۔ اسمبلی ہال میں ہی نہیں اس کے باہر ہری گھاس پر سڑکوں پر سکریٹریٹ کے سامنے وسیع میدان میں تل رکھنے کی بھی جگہ دکھائی نہ دیتی تھی ایسی بھیڑ تو اکثر لوگوں نے دیکھی ہوگی۔ پر آدھی رات کو کسی بھی مقام پر دو تین لاکھ آدمی اکٹھے نہ ہوئے ہوں گے۔ ہاں ایک بات مستثنیات میں سے اور بھی ہو سکتی ہے۔ مہابھارت کے زمانہ میں ورندہ بن میں کرشن جنم اشٹمی کے موقع پر شاید اتنے عورت مرد بانکے بہاری کے درشنوں کے لئے جمع ہو جاتے ہوں۔ شری کرشن کا جنم بھی ٹھیک اسی وقت ہوا تھا۔ جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان پر آزادی کا نزول ہوا۔

اس رات کو "جن گن من" اور "بندے ماترم" کے قومی گیتوں کی میٹھی آواز کیسی دلفریب معلوم ہو رہی تھی۔ یہ گیت پہلے بھی بہت سی بار سنے تھے۔ مگر اس رات جیسے ایک ایک لفظ پکار پکار کر اپنا مفہوم بھی سننے والوں کے کانوں میں گھول رہا تھا۔ اس رات سرسبز، ہرا بھرا۔ طاقت ور

اور دشمن کش جیسے الفاظ جو ان گیتوں میں استعمال ہوئے ہیں کا صحیح مطلب دراصل اس روز سمجھ میں آیا۔ جب جن گن من شروع ہوا۔ تو اس کی شیریں لے کے ساتھ ہزاروں سر جھوم اٹھے۔ لیکن جیسے ہی اس قومی گیت میں پنجاب اور سندھ کا ذکر آیا تو مجمع میں بہت سے لوگ پھٹی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ آزادی کی دیوی کی پوجا ایک دم پراگندہ ہوگئی۔ اچانک موجود لوگوں کو ملک کی تقسیم یاد آگئی۔ کئی آنکھیں نم ہوگئیں۔ کئی غصہ سے لال دکھائی دینے لگیں۔ آزادی کے نزول کی خوشی کے سمندر میں لوگ بہہ سے گئے تھے۔ سندھ اور پنجاب کا نام سنتے ہی یادیں جاگ اٹھیں۔ اور ملک نے آزادی کی جو قیمت چکانی منظور کی تھی۔ اس کی یاد تازہ ہوگئی۔ اس جوش و امنگ میں درد و تکلیف کا احساس ہوا۔

ایک لمحہ کیلئے بندے ماترم اور جن گن کی آوازیں جنگی نظموں کے مانند محسوس ہوئیں۔ رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ پرجوش عوام نے اپنے لیڈروں کی طرف دیکھا۔ تقریباً سبھی لیڈر گہری سوچ میں ڈوبے معلوم ہوئے۔ جو تیر عوام کے دل میں پیوست ہوا تھا اس کی نوک سے لیڈر بھی محفوظ نہیں تھے۔ وہ عوام سے بھی زیادہ بےچین دکھائی دیتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے جنگ آزادی میں عوام کی صرف رہنمائی ہی نہیں کی تھی۔ بلکہ بہت سی بار اکھنڈ (غیر منقسم) بھارت کے وعدے بھی کئے تھے اور تقسیم کے امکان کو محض ایک افسانہ بتلایا تھا۔ وہ جیسے قسمت کی ستم ظریفی پر خود حیران تھے کہ پوری یقین دہانیوں کے باوجود انھیں خود تقسیم کی تجویز پر دستخط کرنے پڑے تھے۔

تقریباً دو بجے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اسمبلی ہال سے نکلکر وائسرائے ہاؤس گورنر جنرل کو مدعو کرنے گئے۔ آزادی کی خوشی میں عوام بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ خالی جگہ تھی ہی نہیں اور بھیڑ اس قدر تھی کہ یہ پتہ لگانا مشکل تھا کہ لوگ کدھر جا رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد وزیر اعظم گورنر جنرل کو ساتھ لئے اسمبلی ہال میں آ گئے۔ اس وقت لوگوں کا جوش انتہائی حدوں کو چھو چکا تھا۔ لیڈروں کے استقبال میں بار بار نعرے لگائے جا رہے تھے۔ اس وقت سبھی کچھ نیا اور بے مثال معلوم ہوتا تھا۔ بے مثال جشن۔ بے مثال نظارہ۔ بے مثال جوش۔ بے مثال حب الوطنی اور بے مثال مجمع۔

تین بجے تک حلف وفاداری کے بعد یہ جشن ختم ہوا۔ کچھ لوگ گھروں کو واپس ہو گئے۔ بہت سے ہرے لانوں اور فٹ پاتھوں پر سو رہے۔ اگلے دن ۱۵ اگست کو آٹھ بجے پنڈت جواہر لال نہرو نے لال قلعہ پر یونین جیک کی جگہ بھارت کا ترنگا جھنڈا لہرایا۔ دلی ہزاروں سال پرانا شہر ہے۔ اپنی تاریخ میں اس نے ایک مقام پر اسقدر وسیع عوام کا مجمع شاید ہی کبھی دیکھا ہوگا۔ جتنا اس دن لال قلعہ کے آس پاس اکٹھا ہو گیا تھا۔ مقامی اخباروں اور سرکاری اندازوں کے مطابق وہاں دس لاکھ سے کم آدمی نہیں تھے۔ دلی گیٹ سے لے کر کشمیری گیٹ تک اور جامع مسجد سے لال قلعہ تک کہیں سڑک یا زمین دکھائی نہیں دیتی تھی۔ سوائے لوگوں کی بھیڑ کے، سیلاب جیسی اس بھیڑ کو منتشر ہونے میں چار گھنٹے لگے۔ سبھی سڑکیں تقریباً ۴ بجے شام تک لوگوں سے بھری رہیں۔

آزادی جنم لے چکی تھی۔ صدیوں بعد ہندوستان آزاد ہوا تھا۔ ہر ایک عورت و مرد دل میں نئی نئی آشائیں لئے مست ہو رہا تھا۔ زیادہ تر لوگ ۱۵ اگست کو رام راجیہ کے قیام کا دن سمجھ رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اب ایسے دور کا آغاز ہوا ہے جب سبھی مسائل۔ برائیاں۔ دکھ۔ جھگڑے آپ ہی آپ دور ہو جائیں گے شاید اسی لئے وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ کیا وہ غلط فہمی میں تھے؟ کیا وہ ضرورت سے زیادہ پر امید ہونے کے مجرم تھے؟ ان سوالات کا جواب ۱۹۴۷ء کے بعد کے واقعات ہی دے سکتے ہیں۔

(۱۲)

قیامت کا منظر

جس وقت دلی آزادی کے نزول کی خوشیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ٹھیک اسی وقت مغربی پنجاب کے دارالخلافہ میں مصیبت کے کالے بادل امڈ رہے تھے۔ دس اگست سے جس منصوبہ بند ظلم وستم کا سلسلہ شروع ہوا اس نے مغربی پنجاب کے سبھی غیر مسلموں کا لاہور جیسے شہر میں بھی جینا حرام کر دیا تھا۔ہندوؤں اور سکھوں کے لئے ایک ایک پل بھاری ہو رہا تھا۔وہ دشمنوں سے گھرے ہوئے قلعہ کے فوجیوں کی طرح اپنے کو سمجھنے لگے تھے۔ان کے لئے ہر ایک دن آگ سے گذرنے کے مانند تھا اور ہر رات دوزخ کے برابر تھی۔

لاہور کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔اب وہاں سے نکلکر امرتسر تک پہونچنے کا مسئلہ تھا تیرہ و چودہ اگست کو مار کاٹ۔آتش زنی اور توڑ پھوڑ کے جو دل ہلا دینے والے واقعات ہوئے ان کی خبر تک صحیح وقت پر دلی نہیں پہونچ سکی تھی۔

کروڑوں روپیہ کی سکنائی وغیر سکنائی دولت چھوڑ اور جان ہتھیلی پر رکھ لاکھوں

آدمی بھارت کی نئی سرحدوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس دکھ بھری آزمائش کی تفصیلی خبریں ۱۶ اگست کو پہلی بار امرتسر سے دلّی پہونچی۔ آزادی کا جوش و خروش آن کی آن میں غم و غصّہ میں بدل گیا۔ اگلے ہی دن وزیر اعظم لاہور پہونچے۔ مگر کھیل ختم ہو چکا تھا۔ اگست کے پہلے ہفتہ میں انھوں نے لاہور کے باشندوں کو وہیں ڈٹے رہنے کا مشورہ دیا۔ اس مشورہ کو دہرانا اب بے سود ہی نہیں بلکہ مذاق کا موضوع بھی تھا۔ اس لئے اب تمام زور مغربی پنجاب سے ہندو اور سکھوں کی نکاسی پر لگانا مناسب خیال کیا گیا۔ لاہور کے درجنوں بنک۔ بیمہ کمپنیاں تعلیمی ادارے۔ مشہور اخبار۔ چھاپے خانے۔ اور غیر سرکاری تنظیمیں لاہور سے نکل کر دلّی میں ہی سما سکتے تھے۔ ان اداروں میں کام کرنے والے ہزاروں ملازمین کے خاندان جیسے تیسے بھارت کی راجدھانی میں پہونچے۔ ۳۱ اگست تک لاہور اور اس کے آس پاس کے تقریباً دو لاکھ شرنارتھی دلّی آ چکے تھے۔ مقامی لوگوں نے ان کو خوش آمدید کہا اور جتنا ہو سکتا تھا ان کی خدمت کی۔

دلّی کی پاک سرزمین کتنی ہی امن پسند اور بھائی چارہ کی علامت رہی ہو پھر بھی دو لاکھ بے گھر، ستائے ہوئے منتشر اور اُجڑے لوگوں کے بوجھ سے بالکل نہ جھکنا کیسے ممکن تھا۔ بیگناہ غمزدہ لوگوں کی دردناک کہانی اور ان کی ناقابلِ برداشت آہ و فغاں نے دلّی کے دل پر ضرب لگائی ماحول زہریلا ہونے لگا۔ افسروں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن غم و غصّہ کی جوالا بھڑکتی ہی گئی۔ دراصل اس جذبہ کے پیچھے محض بہیمانہ پن نہیں تھا۔ اس کے اقتصادی اسباب بھی تھے۔ لاکھوں ہندو سکھ جو دلّی میں رہ کر ہی زندگی گزار سکتے تھے آخر کہاں جاتے۔ حکومت خود بے بس تھی اور اس کے وعدوں میں مطلب و مفہوم ڈھونڈھنا ریت سے سونا نکالنے کے برابر تھا۔ حکومت ان بدقسمت لوگوں کی امداد کے لئے کوئی کسر باقی نہیں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وزیرِ اعظم سے لے کر دوسرے افسروں تک سبھی شرنارتھیوں کے لئے اپنی ہمدردی کو

عملی جامہ پہنانے کے لئے بے چین تھے مگر یہ کام اس قدر بڑا تھا۔ کہ لاکھوں شہریوں کے ذریعہ دی امداد اور سرکاری فراخدلی بھی اس کے لئے ناکافی دکھائی دے رہی تھی۔ پورے طور پر بے قصور ہوتے ہوئے بھی سرکار پر نکتہ چینی قدرتی بات تھی۔

بہت سی وجوہات سے کشمکش اس قدر بڑھ گئی کہ خوفناک فسادات کی پیش گوئی کرنے کے لئے کسی نجومی کے علم کی ضرورت نہ تھی۔ آنکھوں سے دیکھنے والا کوئی بھی سمجھدار انسان آنے والے دھماکہ کے آثار آسانی سے فضا میں دیکھ سکتا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں شرنارتھی ریلوے اسٹیشن پر پڑے ہوتے تھے۔ مسافر خانہ اور پلیٹ فارم پر ہی ان کا حق رہ گیا تھا۔

آخر ۵ ستمبر کو فرقہ وارانہ آگ بھڑک اٹھی۔ قرول باغ میں کچھ سنا تا تھا مگر لوگ پہلے کی طرح اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی آٹھ بجے کے قریب دوڑ بھاگ اور مار دھاڑ کا شور سنائی دیا۔ میں دفتر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ نہا دھو کر کپڑے پہن بس اڈے کی طرف چل دیا۔ ابھی گوردوارہ روڈ پر نہیں پہونچا تھا کہ دور سے لوگوں کی کئی ٹولیاں دکھائی دیں۔ اسی دوران دو چار بابو اور مل گئے۔ ایک آدمی بھاگا ہوا ہمارے پاس آیا اور بولا "دلّی میں خوفناک فساد ہو گیا ہے سب بسیں خالی واپس چلی گئی ہیں اگر آپ خیریت چاہتے ہیں تو اپنے گھر واپس چلے جائیں۔"

جان بچانے کا جذبہ سب سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ پھر کچھ دیر بحث و مباحثہ کرنے کے بعد ہم اس انجان آدمی کا مشورہ قبول کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ دوپہر کے وقت ٹیلیفون کرنے پر پتہ چلا کہ قرول باغ اور سبزی منڈی۔ پہاڑ گنج اور ایک دو اور بستیوں میں زبردست فساد ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس کافی ہتھیار اور گولہ بارود تھا۔ کئی جگہ ڈٹ کر جنگ ہوئی۔ زیادہ تر مسلمان بھی غریب اسی قدر معصوم تھے جتنے پاکستان سے آنے والے

شرنارتھی اس اضطراری دور میں قصوروار اور بے قصور کا فرق شاید ہی کسی نے کیا ہو۔

فسادات برابر پھیلتے گئے۔ رفتہ رفتہ سرکاری افسر دفتروں کو بھول گئے۔ یہاں تک کچھ دن کے لئے سکریٹریٹ کو بند رکھنا ہی مناسب خیال کیا گیا۔

سب سے بھیانک فساد ۸ ستمبر کو نئی دلّی میں ہوا۔ سرکار کی چہیتی اور بابو لوگوں کی بستی اپنی نزاکت کے لئے مشہور تھی۔ یہاں پہلے کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا تھا۔ اور تو اور یہاں کبھی کرفیو تک کی آنچ نہ پہونچی تھی۔ لیکن ۸ ستمبر کو جو طوفان اٹھا۔ اس نے کناٹ پلیس۔ گول مارکیٹ، بابر روڈ۔ لودھی روڈ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ درجنوں دکانیں اور گھر دن دہاڑے لوٹ لئے گئے۔ مار پیٹ کی طرف فسادیوں کی اتنی توجہ نہ تھی۔ جتنا لوٹ کھسوٹ کی طرف اس حادثہ کا پتہ لگتے ہی پنڈت نہرو خود کناٹ پلیس پہونچے اور ہاتھ میں بیت لئے بلوائیوں کا پیچھا کرنے لگے۔

دو گھنٹوں میں فساد دبا دیا گیا۔ مگر بہت سی دکانیں لٹ چکی تھیں۔ جوتے۔ گھڑیاں۔ طرح طرح کے صندوق اور دوسری قیمتی اشیاء کے ڈھیر دکانوں کے آگے لگے تھے۔ جو جس کے ہاتھ لگا۔ اٹھالے بھاگا۔ فوجیوں کو دو بار گولی چلانی پڑی۔ جس سے قریب دس آدمی مارے گئے۔

دلّی میں پندرہ روز تک بد انتظامی رہی۔ شہری زندگی ایکدم منتشر ہو گئی۔ ہوائی جہاز کو چھوڑ کر آمد و رفت کے دوسرے تمام ہی ذرائع خطرے سے خالی نہ تھے۔ ڈاکخانہ تک ہڑتال کر بیٹھے۔ کم از کم قرول باغ کی بات تو میں جانتا ہی ہوں۔ دو ہفتہ تک یہاں کے ڈاکخانوں میں خطوط آتے رہے۔ مگر تقسیم نہیں کئے گئے۔ لوگوں کو کچھ دن بعد اطلاع دی گئی کہ وہ اپنے خطوط ڈاکخانہ میں جا کر چھانٹ لیں۔ میں بھی ڈاکخانہ پہونچا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر بڑی ہنسی آئی۔ کونے میں ایک طرف پوسٹ کارڈوں کا ڈھیر۔ دوسری طرف لفافوں کا انبار لگا تھا۔ اناج منڈی میں جیسے چنا گیہوں بکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح خطوط پڑے تھے۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ کچھ دیر تک

میں نے بھی ڈھیر میں ہاتھ مارے۔ مگر جلدی ہی عقل آگئی۔ میں نے سوچا چٹھیاں اگر نہیں ملیں گی تو کیا غضب ہو جائے گا۔ کون نہیں جانتا دلّی میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ان حادثوں کے سامنے خط ملنے یا نہ ملنے۔ کوئی گھر میں خیریت سے ہے یا اسپتال میں۔ یہ جاننے کی اہمیت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ اس طرح اپنے دل کو سمجھا میں نے گھر کی راہ لی۔

ہمیں ہری سبزی کھائے اور دودھ کا دیدار کئے دس دن ہو چکے تھے۔ ڈبہ بند ترکاریاں اور ڈبہ بند دودھ سے کام چل رہا تھا۔ یہ ڈبے بھی ختم ہو گئے دودھ کا بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ گھر میں کئی بچّے تھے۔ میں نے نوکر دودھ کی تلاش میں بھیجا۔ تین گھنٹہ تک جب وہ واپس نہ آیا۔ تب ہم سب نے بنا دُودھ کی ہی چائے پی ڈالی۔ شام کے چار بجے شیو سنگھ لوٹا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مگ تھا۔ اور دوسرے میں ایک بکری کا کان دودھ تو کہیں ملا نہیں۔ بھلا مانس کہیں سے گھومتی پھرتی بکری پکڑ لایا۔ ناراض ہوتے ہوئے بھی ہم لوگوں نے نوکر اور بکری کو خوش آمدید کہا۔ بچّوں کے مزے آگئے۔ جب چاہتے تازہ دودھ مانگ بیٹھتے۔

ہری ترکاری ہمیں ستمبر کے آخری ہفتہ میں نصیب ہوئی۔

۱۴

دو سنسنی خیز مہینے

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں نے تو دلی کا ماحول ہی بدل ڈالا۔ آزاد ہندوستان کی راجدھانی ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ بہت سے ملکوں کے سفیر اور دوسرے نمائندے یہاں رہنے لگے تھے۔ راجدھانی میں اس طرح کا فساد ہو کسی بھی محب وطن کو اچھا نہیں لگا ہوگا۔ مگر حالات ایسے غیر معمولی اور شدید تھے کہ کسی کا بس نہیں چلتا تھا یہ دلیل کہ پاکستان بھی ہمارے بھائیوں کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ کر رہا ہے یہاں کے سمجھدار لوگوں کو جچتی نہیں تھی۔ پاکستان اور ہندوستان میں فرق بھی تو زمین آسمان کا تھا۔ ایک ملک کی بنیاد ہی فرقہ پرستی تھی۔ اور دوسرا ڈنکے کی چوٹ اپنے کو سیکولر قوم کہہ رہا تھا۔ یہ فرق آسان ہوتے ہوئے بھی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔ بدلے کے جذبات اور برائی کا بدلہ برائی سے دو کا نعرہ انسان کے خون میں سمایا ہوا تھا۔

فساد شروع ہونے کے ایک ہفتہ بعد ہی گاندھی جی دلی آگئے۔ ان کے خیالات کو

یہاں کے ماحول نے بلاواسطہ اور بلواسطہ دونوں طرح سے متاثر کیا تھا۔ ان کی مخالفت بھی خوب ہوئی۔ اکثر روزانہ پرارتھنا سبھا میں موجود لوگوں میں سے کوئی نہ کوئی شک وشبہ کا اظہار کرکے گاندھی جی کے پروگرام میں رکاوٹ ڈالتا تھا۔ ہر ممکن طریقے سے گاندھی جی ان شبہات کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن سرکاری کوششوں کے باوجود فضا رواداری کے خلاف تھی۔ ایک اوسط شہری کے کیا خیالات تھے اس کا اندازہ دلّی کے ایک اخبار کے تبصرہ سے لگایا جاسکتا ہے جس نے راجدھانی میں فسادات اور شرنارتھی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: "جس وقت دلّی نئی دلہن کا لباس پہنے نئی نویلی قابل احترام دلہن کی طرح پریتم سے اٹھکھیلیاں کررہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت ہندوستان کے شمال مغربی حصّوں میں بھارت کی لاکھوں بہو بیٹیوں کا سہاگ لٹ رہا تھا۔ جس وقت پنڈت نہرو لال قلعہ پر جھنڈا لہرا رہے تھے اور شبھاس بوس کو خراج عقیدت پیش کررہے تھے۔ اسی وقت امرتسر ریلوے اسٹیشن پر خون میں ڈوبی ہوئی ایک گاڑی آئی تھی جس کے ایک تہائی مسافر ایسے تھے جو زندگی کا آخری سفر پورا کرچکے تھے۔ بہت سے موت وزندگی کے درمیان لٹک رہے تھے۔ ان لوگوں کا قصور کیا تھا؟ انھوں نے کونسا جرم کیا تھا؟ جرم صرف یہ تھا کہ وہ غیر مسلم تھے۔ ہمارے رہنماؤں نے بہت سی یقین دہانیوں کے خلاف پاکستان بنوانا منظور کیا تھا۔ اس فیصلہ کا بھیانک انجام پاکستان کے بے قصور ہندوؤں اور سکھوں کو برداشت کرنا پڑا۔

"ابھی ابھی ایک ماہ ہوا ہمارے نیتا ان لوگوں کو وہیں پر ڈٹے رہنے کا مشورہ دیکر آئے تھے۔ کیا اپنے لیڈروں کے مشوروں پر عمل کرنے والوں کو یہی سزا ملنی چاہئے تھی؟ جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم مصیبت زدوں کی پوری طرح امداد کریں اور جو نقصان انھیں اٹھانا پڑا ہے سو فیصدی اس کو پورا کریں۔"

اس مسئلہ کا سرکار کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ افسروں نے وعدے کرتے رہنے میں ہی اپنی خیر سمجھی۔ اُکتاتے ہوئے مصیبت زدوں اور ان کے حامیوں کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے مقامی مسلمانوں کی جائداد پر اپنا حق سمجھا تو قانون کی نظر میں یہ بھلے ہی جرم ہو لیکن اسے کسی بھی طرح غیر فطری اور غیر مناسب واقعہ نہیں کہا جا سکتا۔

اس کے قطعی برعکس گاندھی جی کے خیالات تھے۔ ان کا آدرش بلاشبہ بہت اونچا تھا باپو کا کہنا تھا کہ ہندوستان سچائی اور عدم تشدد کے راستے پر چلنے کا عہد کر چکا ہے۔ شرنارتھیوں سے ہماری پوری ہمدردی ہے۔ ہمیں اُن کی امداد میں کچھ بھی اُٹھا نہیں رکھنا چاہئے۔ لیکن یہاں کے بے قصور مسلمانوں کو ان کی مرضی کے خلاف پاکستان بھیجنا یا ایسا کرنے کے لئے انہیں مجبور کرنا، شرنارتھیوں کی امداد کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ یہ دور اندیشی نہیں تنگ نظری ہے اور انتقام کا اندھا جذبہ ہے۔ باپو جی کو یقین تھا کہ اگر یہاں کے لوگ مسلمانوں سے اچھا برتاؤ کریں گے اور انہیں اپنے ساتھ رکھیں گے تو پاکستان کو مجبور ہو کر اپنے اُجاڑے ہوئے باشندوں کو پھر سے پاکستان میں بسانا پڑے گا۔

باپو کے کٹر سے کٹر مخالف بھی آج یہی تسلیم کرتے ہیں کہ شرنارتھی مسئلہ کا وہی حل تھا جو گاندھی جی اپنی پراتھنا سبھاؤں میں بتلایا کرتے تھے۔ ان میں اور ان کی مخالفت کرنے والوں میں فرق صرف وقت کا تھا۔ باپو سچائی کے پجاری ہونے کے علاوہ دور اندیش بھی تھے اور اس مسئلہ کا دور رس حل سوچتے تھے۔ اِدھر ان کے مخالف جذباتی ہونے کی وجہ سے فوری انصاف کی مانگ کرتے تھے۔ مصیبت زدوں کے لئے کونسا راستہ زیادہ مفید تھا۔ بہت سے لوگ اب سمجھ گئے ہیں۔ رہے سہے لوگ بھی سمجھ جائیں گے۔

پانچ لاکھ شرنارتھیوں کے دلّی میں آجانے اور ستمبر کے فسادات کی وجہ سے اکتوبر اور نومبر کے

ماہ بہت ہی سنسنی خیز ہو گئے تھے۔ راجدھانی میں انتظامی بدنظمی اپنی انتہا کو پہونچ چکی تھی۔ تقریباً دو لاکھ مسلمان اپنی حفاظت کے لئے پرانے قلعہ اور ہمایوں کے مقبرہ میں پہونچ گئے تھے۔ یہاں افسروں نے ان کے لئے کیمپ کھول دیئے تھے۔ یہاں ان کی حفاظت۔ کھانے اور پاکستان جانے کے لئے ریل کا انتظام کیا گیا تھا۔ جو گھر دلّی میں خالی ہوئے تھے ان پر قبضہ کرنے کے لئے لاکھوں شرنارتھی بیچین تھے۔ خوب نفسا نفسی مچی۔ جو طاقت ور تھا اس کے مزے آ گئے۔ امن پسند اور قانون پر عمل کرنے والے اِدھر اُدھر بھٹکتے رہ گئے۔ مکان تھوڑے تھے اور بے گھر زیادہ۔ ان مکانوں کا الاٹ منٹ سرکار کے بس کی بات نہ تھی۔ مسلمانوں کے گھر بھر جانے کے بعد بھی لاکھوں آدمی سڑکوں۔ دھرم شالاؤں۔ سرآئن ریلوے اسٹیشنوں دوستوں رشتے داروں کے گھروں میں پڑے تھے۔

پھاٹک حبش خاں میں کچھ مسلمانوں کے خالی گھروں کو سرکار نے تالا لگا دیا تھا۔ اور شرنارتھیوں کو ان میں گھسنے سے زبردستی روکا ہوا تھا۔ بیچینی تو دلّی میں عام تھی اس واقعہ نے شرنارتھیوں کو اور زیادہ پریشان کر دیا۔ اکتوبر کے آخری ہفتہ میں پھاٹک حبش خاں کے مکانوں پر حملے ہونے لگے۔ کچھ مکانوں میں شرنارتھی زبردستی گھس گئے۔ پولیس سے مڈبھیڑ اور باہمی لڑائی روزانہ کی بات بن گئی۔ مسلمانوں کو گاندھی جی کے سوا اور کوئی محافظ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ انھوں نے باپو جی سے داد فریاد کی۔ باپو کو یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کے لئے ہماری ہمدردی کا بھی ثبوت ہو سکتا ہے کہ کچھ خالی مکان سرکار پاکستان سے لوٹنے والے مسلمانوں کے لئے خالی رکھے۔ گاندھی جی کے دل میں شرنارتھیوں کے لئے بھی بہت جگہ تھی۔ وہ ان حادثوں کی ذمہ داری مظلوموں سے زیادہ حکومت پر رکھتے تھے۔

ان حالات سے بیچین ہو کر مہاتما گاندھی نے ۱۳ جنوری کو مرن برت کا اعلان کر دیا۔

ان کا مقصد متذکرہ بالا مسلمانوں کے گھروں کو خالی کرانا اور شرنارتھیوں کے لئے دوسرے مکانوں کا انتظام کرانا تھا۔ گاندھی جی کے برت سے سرکاری حلقے گھبرا گئے۔ اب سبھی کی توجہ شرنارتھی مسئلہ کی طرف مبذول ہو گئی۔ شرنارتھیوں کے لیڈروں نے بھی سمجھداری کا ثبوت دیا۔ اور سرکار کو اس گتھی کو سلجھانے میں ان کا پورا تعاون ملا۔

گاندھی جی کی زندگی سبھی کو پیاری تھی۔ سبھی پارٹیاں ان کو مطمئن کر کے ان کا برت تڑوانا چاہتی تھیں۔ اس کوشش میں تین پارٹیاں شامل تھیں۔ شرنارتھی۔ مقامی مسلمان۔ اور حکومت۔ تینوں نے اس مسئلہ کو سلجھانے کی دل سے کوشش کی۔ شرنارتھیوں اور مسلمانوں نے جیسا عہد کیا تھا اس کے مطابق عمل بھی کیا۔ سرکار نے شرنارتھیوں کو کچھ ہی ہفتوں میں مکانوں میں بسانے کا وعدہ کیا۔ ان کوششوں میں امید کی جھلک دکھائی دی اور چھ دن بعد گاندھی جی نے برت توڑ دیا۔

آج شرنارتھی کہتے ہیں کہ جہاں ہم نے اپنے عہد پر عمل کیا۔ وہاں حکومت اپنے وعدہ کو تین ہفتوں میں تو کیا تین سالوں میں بھی پورا نہیں کر پائی۔ آج بھی دلّی میں ہزاروں شرنارتھی خاندان بے گھر ہیں، گاندھی جی اس صورت حال کو کبھی برداشت نہ کرتے۔ اگر وہ اس اگست (۱۹۵۰ء) میں زندہ ہوتے تو شرنارتھیوں کو بارش سے بچانے کے لئے کھلے میدانوں سے گھروں میں نہ لے جایا جاتا بلکہ خود گھر ان کے پاس لائے گئے ہوتے۔

(۱۴)

افق پر دو سورج

پچھلے دس سالوں میں دلّی میں جتنے بھی بھیانک حادثات ہوئے۔ جتنے بھی انقلابات آئے۔ ان میں سب سے بڑا حادثہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کا تسلیم کیا جائے گا۔ اس روز شام کو ہندوستانیوں نے خاص طور پر دلّی میں رہنے والوں نے افق پر دو سورج غروب ہوتے دیکھے۔ ایک سورج تو وہ تھا جو ازل سے کائنات کو روشن کرتا چلا آیا ہے۔ دوسرا سورج ہندوستان کی سیاست کے آسمان کا سورج مہاتما گاندھی تھے۔ یہ دونوں سورج ۳۰ جنوری کی شام کو قریب ساڑھے پانچ بجے غروب ہو گئے۔ قدرت کا سورج تو ہمیشہ کی طرح اگلے دن پھر طلوع ہوا لیکن ہندوستان کا سورج ہمیشہ کے لئے افق کے دوسری طرف چلا گیا۔

دلّی کے لوگوں کو اس دل ہلا دینے والے حادثہ کی اطلاع چھ بجے ریڈیو سے مل گئی تھی۔ خبر سنتے ہی ساری دلّی غم میں ڈوب گئی۔ عورت مرد گھروں سے نکل برلا ہاؤس کی طرف امڈ پڑے۔ شہر کے سبھی سنیما گھر، کلب اور تفریح کے دوسرے مقامات بند کر دیئے گئے۔ چھوٹے بڑے

سبھی ہوٹل اور چائے خانے فوراً بند کر دیئے گئے۔ آل انڈیا ریڈیو کا عام پروگرام منسوخ کر دیا گیا۔ ۱۱ بجے تک گاندھی جی کے جیون۔ ان کے آدرش اور ان کی زندگی کے بارے میں ہی ریڈیو تقریریں و نظمیں نشر کرتا رہا۔

برلا بھون کو جانے والی سبھی سڑکوں پر زبردست بھیڑ تھی۔ سات بجے تک برلا بھون کے سامنے ہزاروں لوگ اکٹھے ہو گئے۔ بھیڑ پر غم چھایا ہوا تھا۔ سبھی لوگ خاموش تھے۔ جیسے سب کے ہونٹوں پر تالے لگے ہوں۔ پنڈت نہرو سردار پٹیل اور دوسرے وزیر و لیڈر برلا بھون کے اندر غمزدہ افسردہ گھومتے نظر آرہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ آ نہیں رہا تھا۔ کیا وزیر کیا لیڈر اور کیا عام پبلک سبھی کی قوت فکر جیسے اس اچانک حادثہ سے سلب ہو گئی تھی۔ بھیڑ میں کبھی کبھی قاتل کا ذکر ہوتا تھا۔ کوئی کہتا قاتل ضرور کوئی سر پھرا شرنارتھی ہو گا۔ پاس ہی کھڑا دوسرا شخص بولا یہ کام کسی جنونی سنگھی کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ باپو کا قتل بھارت ماتا کے جسم پر کسی مسلم لیگی مسلمان کا آخری تمغہ ہے۔

اس طرح ایک دو گھنٹے برابر کانا پھوسی ہوتی رہی۔ ماحول کی سنگینی۔ افسردگی۔ خاموشی اور غم پر گفتگو کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ دل کی افسردگی کے سبب سب کے گلے رندھے ہوئے تھے۔ کوئی بھی اونچی آواز میں نہیں بول سکتا تھا۔ جو بھی کچھ کہتا پاس کھڑے شخص کے کان میں ہی کہتا۔

پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے بار بار کہنے پر بھی مجمع نو بجے رات تک البقرق روڈ پر ہی جما رہا۔ (البقرق روڈ کا نام اب ۳۰ جنوری مارگ رکھ دیا گیا ہے) کسی کو سردی کی فکر نہ تھی۔ اور نہ اس بات کی فکر تھی کہ گھر کس طرح لوٹا جائے گا۔ دلّی میں ذرائع آمد و رفت اتنے "اچھے" ہیں کہ ایکبار گھر سے نکل پڑنے پر پھر کوئی جیوتشی ہی بتا سکتا ہے کہ اب وہ گھر کب واپس آسکے گا۔ البقرق روڈ پر تو اس وقت ساٹھ ہزار عورت مرد جمع تھے۔ نو بجے کے قریب بجلی کی روشنی میں برلا بھون کے اوپر سے مہاتما گاندھی۔ کے ابدی نیند میں سوئے چہرے کے روتی بلکتی جنتا کو دیدار کرائے گئے۔ عقیدت سے

سر جھکائے لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو لئے۔

اگلے دن کے پروگرام کے بارے میں ریڈیو پر اعلان ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس عظیم الشان شخصیت کی لاش کا آخری سفر ایک بجے شروع ہونا تھا۔ لوگ نو بجے ہی برلا بھون کے سامنے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دلّی ہی نہیں ملک کے سبھی سرکاری اور غیر سرکاری دفتر اسکول اور دکانیں اس دن بند تھے۔

میں اپنے گھر سے ۱۰ بجے نکلا۔ سڑکوں پر بے پناہ بھیڑ تھی۔ بسوں کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے میں نے برلا بھون تک پیدل ہی جانے کا ارادہ کیا۔ جھنڈے والان کے پیچھے عیدگاہ کے قریب کچھ آدمی کھڑے تھے۔ وہاں پانچ چھ داڑھی والے مسلمان بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ "چلو ہم بھی برلا بھون چلیں" ایک ان میں سے اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ "کسی کو مارنا ہوگا تو ہمیں ماریں اب مزید زندہ رہنے کی خواہش نہیں۔ پچھلے چار مہینوں میں جو کچھ ہوا وہ ہم برداشت کر گئے تھے۔ اب زندگی دشوار ہو گئی ہے۔ جس ہستی نے ہمارے لئے جان کی بازی لگائی تھی اور جس کی حقیقی زندگی نے ہمیں حیات بخشی جب وہی ہستی اس دنیا سے اٹھ گئی تب مر جانے کی کیا اہمیت اور جینے اور مرنے میں کیا فرق؟"

بوڑھے مسلمان کے دل سے نکلے ہوئے یہ الفاظ دلّی والوں کی سمجھ میں آسانی سے آجائیں گے ۱۹۴۷ء کے جھگڑوں کے بعد نئی دلّی میں کسی مسلمان کا دیکھا جانا ایک غیر معمولی بات بن گیا تھا۔ باپو کی مہربانی سے اس وقت بھی دلّی میں دو لاکھ مسلمان ہوں گے۔ مگر وہ زیادہ تر اپنے محلوں میں ہی رہتے تھے۔ ان محلّوں سے باہر نکلنا وہ اب بھی اپنے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔ اسی لئے وہ بوڑھا مسلمان نئی دلّی سے ہو کر برلا بھون جانے کی تجویز کو اس قدر خطرناک سمجھتا تھا۔ مگر ۳۰ جنوری کے حادثے نے سب کے دل بدل دیئے تھے۔ بیسیوں ہندو اور سکھ ان سب مسلمانوں کو اپنی حفاظت

میں لے جانے کیلئے تیار ہو گئے۔

دل ہی دل میں کچھ سوچتا میں بھی ان کے پیچھے ہولیا۔ ارتھی کا جلوس برلا بھون سے ٹھیک وقت پر چلا۔ آدھے گھنٹے تک جلوس چلتا ہی رہا۔ مگر باپو کی ارتھی اب بھی البقرق روڈ پر ہی تھی۔ بھیڑ اسقدر زیادہ تھی کہ دور سے دیکھنے پر انسانوں کا مجمع منجمد دکھائی دیتا تھا۔ راستہ میں خاص طور پہ انڈیا گیٹ کے سامنے وسیع سڑک پر راستہ کے دونوں طرف لاکھوں غم میں ڈوبے عورت مرد باپو کے آخری درشن کرنے کے منتظر تھے۔ جلوس میں ہزاروں مسلمان بھی شامل تھے۔ ان میں نوے فیصدی نے نئی دلی پانچ ماہ کے بعد دیکھی ہوگی۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور طلباء، احرار۔ جمیعتہ العلما کے نمائندے اور دوسرے مسلمان مہینوں بعد اس دن پہلی بار اپنی مرضی سے اپنے غیر مسلمان بھائیوں کے غم میں برابر کے شریک ہو کر آنسو بہا رہے تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر عیدگاہ کے بوڑھے مسلمانوں کو بیشک اطمینان ہوا ہوگا۔

لوگ جلوس میں مختلف صوبوں کے وزیروں اور گورنروں کو دیکھ کر حیران تھے۔ یہ لوگ اسی دن باپو کے لئے اظہار عقیدت کرنے ہوائی جہاز سے دلی آپہونچے تھے۔ جیسے ہی جلوس دلی گیٹ کے پاس پہونچا۔ ہزاروں اشخاص ان میں شامل ہو گئے۔ یہ لوگ غازی آباد۔ میرٹھ۔ ہاپوڑ۔ مرادآباد اور آس پاس کے شہروں اور گاؤں سے آئے تھے۔ مسافروں کی آسانی کے لئے اس دن ریلوے کو ایک درجن سے زیادہ اسپیشل گاڑیاں چلانی پڑی تھیں۔

دھیرے دھیرے جلوس آگے بڑھتا گیا۔ اور پانچ بجے راج گھاٹ جا پہونچا۔ لوگوں کی تعداد آٹھ اور دس لاکھ کے درمیان تھی۔ اسی بھیڑ میں میں نے دو اشخاص کو دیکھا۔ اور ان سے ملنے کے لئے میں ان کی طرف بڑھا۔ یہ تھے میرے پرانے دوست میاں افتخار الدین اور شری منظور قادر۔ یہ دونوں حضرات اسی دن لاہور سے آئے تھے۔ میاں افتخار الدین جن کا گاندھی جی سے پرانا تعلق تھا۔

بہت بیچین اور غمزدہ دکھائی دیتے تھے۔ وہ بولے: "گاندھی جی کے ساتھ روشنی کی آخری کرن بھی غائب ہو گئی۔ اب ہندوستان اور پاکستان کا خدا ہی مالک ہے۔"

پاکستان کی سیاست کے بارے میں افتخار میاں سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر موقع و محل کی نزاکت نے مجھے اس ذکر کو چھیڑنے سے باز رکھا۔ پھر بھی پاکستان کے عوام کی حالت کا ہلکا سا اندازہ میاں صاحب کے ساتھ دو منٹ بات کرنے کے بعد ہی ہو گیا۔ گاندھی جی کے لئے اپنائیت کا یہ جذبہ پاکستانی مسلمانوں میں آج سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ گاندھی جی کے قتل سے جو صدمہ ہندوستان کو پہونچا اس سے کچھ کم ہی پاکستان کے مسلمانوں کو پہونچا ہو گا۔

۶ بجے تک چتا تیار ہو گئی۔ وید منتروں، قرآن کی آیتوں۔ گرنتھ صاحب کے الفاظ اور انجیل کی دعاؤں کے ساتھ شری دیوداس گاندھی نے آخری رسومات ادا کیں۔ آن کی آن میں چندن کی لکڑی کی آگ فضا کو معطر کرتی ہوئی بھڑک اٹھی۔

مغرب میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی لپٹیں۔ اور سرخ آسمان یہ بتا رہا تھا کہ آج کے بعد ہندوستان کا سورج سدا کے لئے ڈوب گیا ہے۔

(۱۵)

راجدھانی میں شرنارتھی

مُلک کی تقسیم اور مغربی پنجاب سے لاکھوں ہندو و سکھوں کے اجڑنے کا لازمی نتیجہ تھا کہ لاکھوں شرنارتھی دلّی میں آئیں اور حکومت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ ایک نو آبادکاری کے منصوبوں کی تشکیل دلّی میں ہی ہوتی تھی۔ اور یہیں سب کچھ سنوائی ممکن تھی۔ اس کے علاوہ مشرقی پنجاب کی حکومت ابھی تک اپنی راجدھانی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ لاہور میں لاکھوں ایسے آدمی تھے جو وہاں کے بنکوں بیمہ کمپنیوں۔ تعلیمی اور کاروباری اداروں میں ہی کام کر کے اپنی زندگی گذارتے تھے۔ تقسیم کے بعد یہ ادارے ایک دو کو چھوڑ سبھی دلّی آ گئے تھے۔ اس لئے نہیں کہ دلّی سے ان کو کوئی خاص محبت تھی۔ بلکہ مشرقی پنجاب کی راجدھانی کا سوال ابھی تک طے نہیں ہوا تھا۔ اور نہ طے ہونے کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

یہ آدمی کتنے ہوں گے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگ سکتا ہے کہ لاہور میں ساٹھ سے زائد بیمہ کمپنیاں۔ اور پچاس کے قریب بنکوں کے دفتر تھے۔ لاہور شمالی ہند میں تعلیم۔ صحافت۔ طباعت

دچھاپہ خانہ وغیرہ کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ ان سبھی اداروں میں ۹۹ فیصد ملازم غیر مسلم تھے۔ ان سب کو اپنے خاندانوں سمیت لاہور چھوڑنا پڑا۔ زیادہ تر لوگوں کو اپنے اپنے دفتروں کے ساتھ ہی دلی آنا پڑا۔ اگر مشرقی پنجاب کی کوئی راجدھانی ہوتی تو ان میں سے بہت کم لوگ دلی آتے۔

جو لوگ لاہور سے دلی آئے۔ ان میں دو لاکھ ایسے ہیں جن کا تعلق متذکرہ بالا اداروں سے تھا۔ ان اداروں کو یہاں سے ہٹائے بغیر ان لوگوں سے دلی چھوڑنے کی اپیل کرنا ایسا ہی فضول تھا جیسے آم سے درخواست کرنا کہ سب پکے پھل نیچے گرا دے۔

سب کچھ بھی ہو۔ لاکھوں شرنارتھیوں نے دلی کا سہارا لیا۔ اس عظیم بھیڑ کو دلی کی زندگی میں کھپانے کے بہت سے قابل تعریف قدم اٹھائے گئے۔ ان کوششوں میں سرکاری جدوجہد قابل ذکر ہے۔ کلرکوں۔ چپراسیوں۔ افسروں اور دوسرے سرکاری و نیم سرکاری ملازمین کی بھرتی کے جتنے دفتر تھے ان کو احکامات دیئے گئے کہ جہاں تک ہو چھوٹی بڑی سبھی نوکریوں کے لئے دوسرے آدمیوں کو اسی وقت لیا جائے جب ضروری قابلیت کے شرنارتھی حاصل نہ ہوں۔ یہ اصول دلی سرکار یا مرکز کیلئے ہی نہیں تھا۔ بلکہ تمام صوبائی حکومتوں پر بھی نافذ کیا گیا۔

دوسرے شہروں اور صوبوں میں اس کا کیا اثر پڑا یہ صحیح طور پر مجھے پتہ نہیں۔ لیکن دلی میں اس کے اثر سے کوئی بھی ناک کان والا شخص ناواقف نہیں رہ سکتا۔ یہاں کی ساری پولیس۔ چونگی کے محرر۔ ڈاک و تار محکمہ کے بابو ہوٹلوں کے بیرے۔ ریلوے اسٹیشن کے قلی۔ میونسپل کمیٹیوں کے ملازم یہ سب ایکدم بدلے گئے۔ ان محکموں میں کام کرنے والے مسلمان سب چلے گئے تھے۔ ہندو وہیں تھے۔ لیکن ان میں سے کچھ اپنے پہلے عہدوں پر تھے۔ بہتوں کی ترقی ہو گئی تھی۔ اور ان کی جگہ نئے شرنارتھیوں کا ہی تقرر عمل میں آیا تھا۔ سرکاری حلقوں میں ان دنوں یہ کہا جاتا تھا کہ تقسیم سے جہاں لاکھوں آدمی لٹے ہیں وہاں خوش قسمت لوگوں کے لئے ہنڈیاں بھی لٹی ہیں۔ بہت سے کلرک افسر

ہو گئے۔ اور سبھی داروغہ ڈپٹی ہو گئے۔
بن گئے۔ اور سپیرا انجینئر بن گئے۔ حوالدار داروغہ ہو گئے۔
یہ ترقی کسی کو بری نہیں لگی۔ اس ماحول میں حسد و جلن کی گنجائش نہ تھی۔ جہاں بھارت اور دوسری
کتابوں میں ٹھیک یہی کہا گیا ہے جہاں مصائب آنے سے انسانوں کی تباہی ہوتی ہے وہاں مصیبت سے
کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے ایسے ہی وقت میں دل اپنی سیکڑوں برائیوں سے پاک ہو کر اونچا اٹھ جاتا
ہے۔ ٹھیک یہی تقسیم کے بعد بھی ہوا۔ محبت۔ بھائی چارہ اور ہمدردی کا جیسا مظاہرہ ۱۹۴۷ء ۔ ۱۹۴۸ء
کی سردیوں میں ہوا اس کا نظارہ صدیوں میں دیکھنے میں نہیں آتا ہے۔ دلّی کے رہنے والوں نے اپنا
راشن خوشی خوشی شرنارتھیوں کو دیا۔ بہت سے مصیبت زدوں کو پہننے کے کپڑے دیئے۔ حوصلہ بندھانے
کے الفاظ اور نیک مشوروں کی تو جیسے جھڑی ہی لگ گئی۔ دلّی ان دنوں کیمپ کے مانند معلوم ہوتی تھی۔
اور یہاں کے رہنے والے رضاکاروں کا کام کرنے لگے تھے۔
نوکری پیشہ شرنارتھی تو جیسے تیسے اِدھر اُدھر کام پر لگ گئے۔ تاجروں کا کام اتنا سہل نہیں تھا۔
جو لوگ مسلمانوں کی خالی دوکانوں میں جا گھسے تھے انھیں کوئی خاص جد و جہد نہیں کرنی پڑی۔ لیکن
مسلمانوں کی دکانیں تو صرف پانچ فیصد شرنارتھیوں کے لئے کافی تھیں۔ باقی لوگوں نے چلتی پھرتی دکانوں
کا سہارا لیا۔ ان دنوں دلّی میں اسقدر ریڑھیاں بنیں کہ اس کام کے لئے میرٹھ و مظفر نگر وغیرہ سے
تمام بڑھئی بلانے پڑے۔ جہاں دیکھو سڑک کے دونوں طرف لکڑی کے کٹہرے اور ریڑھیاں لگی ہیں۔
جن میں سیب۔ انگور سے لے کر چلم تمباکو تک فروخت ہوتی تھی۔ گھڑیاں اور ریڈیو جیسی قیمتی چیزیں
بھی اسی طرح بکتی دیکھی گئیں۔
دلّی کے پرانے دکانداروں نے ہمت اور فراخدلی سے کام لیا۔ سب دکانوں کے سامنے
تخت پوشوں اور ریڑھیوں کی قطاریں لگی تھیں۔ اس قطار کو توڑ کر شاید ہی کوئی گاہک پرانی دکانوں
پر سودا خریدنے جاتا ہوگا۔ دراصل چاندنی چوک۔ کناٹ پلیس نئی سڑک۔ صدر بازار اور کھاری باؤلی

وغیرہ جیسے پرانے بازاروں کو شرنارتھیوں کی نئی دکانوں کی وجہ سے جیسے گھن سا لگ گیا تھا۔ ان چلتی پھرتی دکانوں کی قطار کے پیچھے پرانی دکانوں کی طرف گاہکوں کا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ چاندنی چوک میں غیر مستقل دکانوں اور ریڑھی والوں کی قطاریں اس طرح لگی تھیں جیسے خوانچے والوں کی مٹھائی پر مٹی کی تہہ جمی ہوتی ہے۔

مقامی دکانداروں کو اپنی فراخدلی کی قیمت کا اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ ان میں سے بہت سوں کا کاروبار تو چوپٹ ہو گیا۔ اور انھوں نے پگڑی لے کر کسی شرنارتھی ہی کو اپنی دکان دینے میں بھلائی سمجھی۔ بہتوں سے لوگ اب شکایت کرنے لگے۔ افسروں سے احتجاج ہونے لگا کہ شرنارتھیوں کے لئے نئی دکانیں اور نئے بازار بنوائے جائیں۔ اس لئے نئی دکانیں بھی بننے لگیں۔ دھیرے دھیرے پرانی اور نئی دلّی میں جہاں بھی خالی جگہ ملی وہاں ایک ایک کمرہ کی دکان کھڑی کر دی گئی۔

دلّی کے رہنے والوں یا سرکار کو یہ فکر تو تھی نہیں کہ دکانیں کرایہ پر کیسے چڑھیں گی۔ کیوں کہ دلّی کی آبادی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھومتے پھرتے آدمیوں (جن میں عورتیں بھی شامل تھیں) کی پہونچ سے باہر کوئی مقام رہ نہیں گیا تھا۔ ایک اندازہ کے مطابق دلّی میں دن کے وقت چالیس ہزار آدمی مسلسل سڑکوں پر گھومتے رہتے ہیں۔ ان میں سے سبھی وقت کے پابند نہیں اور سبھی کو اپنی منزل کا صحیح پتہ نہیں۔ نتیجہ میں ہزاروں اشخاص بھٹک کر ایسی جگہ جا پہونچتے ہیں جہاں انھیں کچھ دیر رکنا ہی پڑتا ہے۔ پیدل ہیں تو تھک جانے کی وجہ سے۔ سواری کے شوقین ہیں تو سواری کے انتظار میں۔ اور جہاں خالی آدمی رکا پانی بیڑی سگریٹ لسی وغیرہ پر توجہ گئی۔

اس لئے دلّی میں مسئلہ یہ نہیں تھا کہ دکان کہاں کھڑی کی جائے۔ بلکہ مسئلہ صرف یہ تھا کہ اینٹ اور چونا کیسے حاصل کیا جائے۔

●●

(۱۶)

راجدھانی کی مُشکلات

مُشکل قدرت کا اصول ہے۔ دنیا کے سبھی ملکوں میں سبھی ادوار میں مشکلات رہی ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ سدا رہیں گی۔ اس لئے ان کے ذکر سے کسی طبقہ پر نکتہ چینی کرنا اور اس کے بارے میں کچھ کہنا اتنی ہی سیدھی بات ہے جتنا پانی یا گندھک کی خوبیوں کا بیان کرنا۔ یہ سب زندگی کے اجزا ہیں۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے پہاڑ۔ سمندر۔ زمین وغیرہ۔

میجر سوریہ نارائن پوری میرے دور کے رشتہ دار ہیں۔ دراصل رشتہ دار کم اور دوست زیادہ۔ کلرکی سے پریشان ہو کر وہ ۱۹۴۱ء میں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ فوراً ہی مشرق وسطیٰ چلے گئے۔ تب سے پچھلی مئی ۱۹۴۹ء تک وہ باہر رہے۔ کبھی برما۔ کبھی سنگاپور اور پچھلے دو سالوں سے جرمنی میں۔ پورے آٹھ سال کے بعد پچھلے دنوں ان کا دلّی آنا ہوا۔ راجدھانی میں ہوئی تبدیلیوں کو دیکھ کر انہیں جو تعجب ہوا وہ فطری ہوتے ہوئے بھی میرے لئے ناقابل فراموش ہے۔ ان تبدیلیوں کے بارے میں وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ نیند ہی ان کی زبان کو بند کر سکی۔

اصل میں بات ہے بھی کچھ ایسی ہی۔ ہم لوگ جو روزمرہ کے واقعات کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اپنے جذبہ استعجاب کو ختم کر چکے ہیں۔ دلّی کی غیر معمولی تبدیلیوں کی طرف ہماری توجہ اس وقت جاتی ہے۔ جب ہم ہفتوں مارے مارے پھرتے رہنے پر بھی کسی اسکول میں بچّوں کو داخل نہیں کرپاتے۔ یا جب کسی دوست کے لئے ہمیں مکان ڈھونڈنا ہو۔ یا جب ہزار احتیاط برتنے پر بھی سڑک کے پار کرتے ہوئے کسی سائیکل سوار سے ٹکر ہو جاتی ہے۔ ہم ان کی طرف توجہ کریں نہ کریں۔ واقعی یہ تبدیلیاں بے مثال ہیں۔ شاید ہی اتنے تھوڑے عرصہ میں کسی اور شہر کا نقشہ اس قدر زیادہ بدلا ہو۔ جتنا پچھلے تین سالوں میں دلّی کا بدلا ہے۔

ان تبدیلیوں کے لئے کسی کو مجرم ٹھہرانا مناسب نہیں۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا سرکار اپنی ہمت سے زیادہ خرچ کر کے آنے والوں کو آسانیاں دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ کم از کم اپنی طرف سے اس نے آبادکاری کے کاموں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ پھر بھی کچھ مشکلات ہیں جو کسی بھی حساس آدمی کو کھٹک سکتی ہیں۔

کوئی بھی آنکھوں والا انسان دلّی میں اگر ادھر اُدھر گھومے گا۔ وہ یہاں کے نئے اسکولوں کی طرف متوجہ ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ یہ اسکول زیادہ تر لڑکے لڑکیوں کے لئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر پیڑ کے نیچے۔ یا کسی بڑی عمارت کے سایہ میں شروع ہوئے تھے۔ میں نے گرمیوں میں سایہ کے ساتھ ٹیچرس اور طلبا کو سرکتے دیکھا ہے۔ جب سورج اتنا ناراض ہوا کہ اس نے سایہ کو بالکل سمیٹ لیا تو کلاسیں بھی منتشر ہو گئیں۔ قدرت کی گود میں لکھنا پڑھنا سیکھنے والے ان ہزاروں بچّوں کو کوئی بدقسمت کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا اگرچہ یہ اسکول در حقیقت شانتی نکیتن کے آدرش پر کسی جدید منصوبے کے مطابق نہیں کھولے گئے تھے۔ پھر بھی مجبوری کی آڑ میں اس قابل تعریف کوشش کی برائی نہیں کی جا سکتی۔ نہ ہی اس وجہ سے مقامی افسروں کی برائی کی جا سکتی ہے کیوں کہ ان

دنوں دلّی میں اسقدر طالب علم جمع ہو گئے تھے کہ دس میں سے صرف ایک ہی کے اوپر چھت یہ نیچے دری یا ڈیسک مل سکتا ہے۔ خدا کی مہربانی اور انگریزی سرکار کی دور اندیشی سے دلّی میں گھنے درختوں کی کمی نہیں اور پھر یہاں ہر روز تو بارش بھی نہیں ہوتی۔

تعلیم کا کام برابر چل رہا ہے۔ طلبا کی تعداد کئی گنا زیادہ ہو جانے پر بھی۔ یہ نیک کام رکا نہیں لیکن پرانے اسکول و کالجوں کی وسیع عمارتیں دیکھ کر ماننا پڑے گا کہ یہ ایک مشکل ضرور ہے۔ بھلے ہی یہ تقسیم کی دین ہے جس کی ذمہ داری کسی پر بھی نہیں ڈالی جا سکتی۔

جب اسکولوں کے لئے جگہ کی اسقدر تنگی ہے۔ تو بھلا رہنے کے لئے مکان کہاں سے آئیں گے۔ ابھی سائنس نے اسقدر ترقی نہیں کی کہ خیموں کی طرح گھر بھی ضرورتاً صرف حکم دینے پر کھڑے کئے جا سکیں۔ ایک بڑے افسر کے اندازہ کے مطابق اپریل ۱۹۴۷ء میں دلّی کی آبادی دس لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔ اور رہنے کیلئے مکان صرف آٹھ لاکھ ہی کیلئے تھے۔ اور آج جبکہ مکانوں میں صرف تیرہ ہزار کا اضافہ ہوا ہے۔ جب ایسی صورت حال ہو تو کوئی کیا کرے۔ آج ہزاروں خاندان سڑک کے کنارے لکڑی کے کٹہروں میں یا مغل دور کے کھنڈرات ... میں پڑے ہیں یہ دکھ کا موضوع تو ہو سکتا ہے تعجب کا نہیں۔

یہ بات میں اپنے دوست سمرکر ... ری بار سمجھا چکا ہوں۔ لیکن نہ جانے وہ اسے کیوں نہیں سمجھ پارہے ... یں۔ شری سمیر ریٹائرڈ پولیس افسر ہیں۔ گجرات (پنجاب) میں ان کی دو کوٹھیاں تھیں۔ بدقسمتی سے انہیں دلّی میں کوئی مکان نہیں ملا۔ وہ خاندان سمیت ایک کمرہ اور ایک برآمدہ میں گذارا کر رہے ہیں۔ ایک دن وہ کسی پرانے دوست سے ملنے کوئینس وے گئے۔ وہ وہاں غلطی سے کسی دوسری کوٹھی میں گھس گئے۔ چاروں طرف گھوم گئے مگر اندر سے کوئی نہیں بولا۔ کچھ دیر بعد مالی آیا۔ اس نے بتایا صاحب چھاؤنی گئے ہوئے ہیں۔

پتہ لگا کہ وہ صاحب وہاں اکیلے ہی رہتے ہیں۔ سمیر جی کے تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ بڑے بڑے آٹھ کمروں کی اتنی بڑی کوٹھی۔ اور رہتا ہے اس میں صرف ایک آدمی۔ یہ سوچتے ہی وہ ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ اور سیدھے میرے پاس آئے۔ اور لگے مجھے بھلی بری سنانے۔ "کہاں ہے اب وہ آپکی وکالت اور آپ کا وہ شیریں وعظ کیا یہی سماجی انصاف ہے کہ میں پانچ نفوس کے ساتھ ایک کمرہ میں رہوں، اور ایک افسر دو ایکڑ کی آٹھ کمروں والی کوٹھی میں، اکیلا ڈٹا ہوا ہے۔ بس بہت ہو چکا ہے۔ میں تو تم سے کہنے آیا ہوں۔ کہ میں تو آج ہی اس کوٹھی کے چار کمروں پر قبضہ کرنے جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں کون مجھے روکتا ہے۔"

ایک سابق پولیس افسر کو اس جذباتی حالت میں دیکھ کر میں بہت گھبرایا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی "خدارا۔ اتنی جلدی بازی ٹھیک نہیں۔ ایک دو دن میں پتہ لگا لیا جائے گا کہ اس کوٹھی میں کون رہتا ہے۔ اور وہ کیا سچ مچ اکیلا ہی ہے یا نہیں"۔

کسی طرح سمجھا بجھا کر بڑی مشکل سے میں نے چائے پینے کے بہانے سمیر جی کو بٹھایا۔ کوئی بھی ... اس حالت میں سمیر جی کو مجرم نہیں ٹھہرائے گا۔ دراصل مکانوں کے معاملہ میں انصاف پسند آدی، ... عقل بغاوت پر اتر آتی ہے۔ مگر ہر سمجھدار انسان باغی نہیں مشکلات اس درجہ زیادہ ہیں کہ ان کو دیکھ کر ہی ... خطرناک حد تک الجھی ہوئی ہے ہوتا۔ وہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دیکھے گا کہ اگر صورت حال ... تو وہ اسے سلجھانے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ اپنے آپ کو بے قصور پاتا ہے تو ضروری نہیں کہ دوسر اس کا قصور وار ہو۔ بات یہ ہے کہ تقسیم اور اس کے نتیجہ میں لاکھوں اجڑے لوگوں کو بسانے کے مسئلہ نے جو مسائل پیدا کئے ہیں وہ کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری تنظیم کے بس کی بات نہیں۔ ان مسائل سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی کتنے پانی میں ہے۔ کچھ بھی ہو ان کا حل ایک دوسرے کی کھال کھینچنا نہیں۔ بلکہ باہمی تعاون اور محبت و پیار ہی ہے۔ سرکار کا تو کہنا ہی کیا۔ کوئی ایک طبقہ نہیں جو دل سے نہ چاہتا

ہوکر شرنارتھی جلد سے جلد بس جائیں۔ اور اس مشکل مسئلہ سے سب کا پیچھا چھوٹے۔

دلّی کی مشکلات کا شرنارتھیوں سے ہی تعلق نہیں ہے۔ شرنارتھی تو دلّی میں ہزاروں برس سے آتے جاتے رہے ہیں۔ یہاں کی مشکلات قدرت کی دین جان پڑتی ہیں۔ اس لئے شاید مسلمان بادشاہ دلّی سے پیار کرتے ہوئے بھی اسے مبارک سرزمین نہیں مانتے تھے۔ اور شاید مبارک زمین کی کھوج میں ہی انھوں نے دلّی کے آس پاس کی زمین کو کھود کر زخمی کر دیا تھا۔ جس شہر میں ہم رہتے ہیں وہ آٹھویں دلّی ہے۔ اس سے پہلے سات دلّیاں بسی اور اجڑیں بری فال سے بچنے کے لئے بستیاں اور شہری محلات ادھر ادھر کھسکتے رہے۔ مگر انجام سب کا ایک ہی ہوا۔

مگر ان مشکلات کا تاریخی پہلو اب موضوع بحث نہیں ہے۔ اب دلّی آزاد ہندوستان کی راجدھانی ہے اب مشکلات کے ساتھ ہیضہ کے چوہوں کا سا سلوک ہوگا۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ ہونا چاہئے اس کا مطلب یہ نہیں کہ دلّی میں رہنے والے سبھی سفیر بن جائیں گے۔ یا سبھی شام گذارنے کے لئے کلبوں کی رونق بڑھائیں گے وہ سنہری دور تو صرف تخیل کی دنیا کا ہی موضوع رہے گا۔ کم از کم یہ تو امید کی جا سکتی ہے کہ پگڈنڈی پر سونے والا کچھ اوپر اٹھیگا۔ جو خاندانی بھکاری ہے اس کو کچھ راحت ملے گی۔ جو گوشالہ کے جانوروں کی طرح تنگ اور گندے گھروں میں رہتے ہیں انھیں بھی چڑھتے سورج کی کرنیں چھو سکیں گی۔ اور جو ہزاروں لڑکے لڑکیاں وسائل کی کمی کے سبب اسکولوں کا منہ نہیں دیکھ پاتے کم از کم وہ آزاد ہند کی راجدھانی میں سرسوتی کی پوجا کر سکیں گے۔

●●

(۱۷)

بابو کیلاش چندر

جنگ ختم ہونے کے کچھ ماہ بعد جب میں دلّی میں رہنے لگا۔ تو کیلاش سے ملنا جلنا اور بھی بڑھ گیا۔ مجھے انہیں یہاں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ایک دن کچھ دوستوں کے ساتھ ہم پرانے قلعے چلے گئے سہانی دھوپ نکلی تھی۔ کھلی جگہ تھی اور کھانے کا سامان ضرورت سے زیادہ ہمارے پاس موجود تھا۔ وہیں کھانا بنایا گیا۔ کھا پی کر اِدھر اُدھر کی گپیں لڑانے لگے۔ اس دن اچانک کیلاش کے منہ سے ایک ایسی بات نکلی جو سات سال بعد بالکل سچ ثابت ہو گئی۔ میں ویسے ہی ہنسی میں کہہ رہا تھا کہ بابر روڈ پر بھی دو تین لاہور کے پرانے دوست مل گئے ہیں۔ خوب دل لگا رہتا ہے۔ نہ جانے کیوں کیلاش فوراً بول اٹھے۔

"اجی جناب ابھی کیا ہے۔ ذرا دیکھتے رہیئے۔ ابھی گنتی کے ہی چند آدمی لاہور سے دلّی آئے ہیں۔ وہ دن بھی دور نہیں جب سارا لاہور ادھر کھنچا آئے گا۔"

کیسی بھیانک پیشن گوئی ثابت ہوئی یہ بات! کبھی کبھی تو کیلاش اپنے الفاظ کو یاد کر کے بڑا اثر لیتے ہے۔ واقعی ایک آدھا لاہور دلّی کی زندگی میں آملا ہے۔ اگرچہ ان کی ان دنوں کی بات کا

۱۹۴۷ء کے حادثات سے ذرا سا بھی تعلق نہیں۔ مگر کیلاش پرانے قلعہ میں کہے گئے الفاظ کے لئے آج تک افسوس کرتا ہے۔

جان پہچان تو کیلاش جی سے لاہور میں ہوگئی تھی۔ وہ دلّی سے اکثر لاہور آیا کرتے تھے۔ اور جب کبھی انھیں اور کوئی ٹھکانا نہ ملتا تو وہ میرے یہاں آ ٹھہرتے۔ ان کی بے تکلفی اور سیدھے پن کا میں قائل ہو چکا تھا۔ مگر ایک مہمان کی بے تکلفی میں کوئی کشش پاتا۔ اتنا بے وقوف میں نہیں تھا۔ ان دنوں تو میں ایسے داؤں پیچ سوچا کرتا تھا۔ جن سے کیلاش سمجھیں کہ میں مزاجاً اسقدر سنجیدہ واقع ہوا ہوں کہ منحوس کہلایا جا سکتا ہوں۔ اور ان کی بے تکلفی کا مجھ پر بہت اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔ اگر میں ان دنوں اتنی سمجھداری سے کام نہ لیتا تو آج کیلاش اور میں اتنے اچھے دوست نہ ہوتے۔ میرے لئے ہوشیار و محتاط رہنا ضروری تھا کیونکہ کیلاش ہمیشہ لگام ڈھیلی چھوڑے رکھتے تھے۔ موقع و محل کی بندشوں سے وہ بہت کچھ اونچے اٹھ چکے تھے۔ اگر میں چاہتا تو چار دن کی بجائے دو مہینہ انھیں اپنے یہاں روک سکتا تھا۔ ان پابندیوں کی فکر مجھے تھی انھیں نہیں۔

کیلاش گھر کے رئیس ہیں۔ اس لئے زندگی کے بارے میں سوچنے کا انھیں کبھی موقع نہیں ملا۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے ہیں۔ اگر دلّی کے ہی کسی دفتر میں کلرک ہو گئے ہوتے تو آج افسر تو ضرور بن جاتے۔ مگر نوکری سے تو وہ دور بھاگتے ہیں۔ بات بھی سچ ہے۔ جسے خدا نے کھانے کو دیا ہو وہ چاکری کرے تو پاگل ہے۔ ان کے والد اچھے تاجر تھے۔ ۱۹۴۶ء میں ہی ان کا انتقال ہو گیا انھوں نے کافی کمایا۔ کئی گھر کے مکان ہیں۔ کیلاش چاہیں تو مکانوں کے کرایہ پر ہی اچھا گذارہ کر سکتے ہیں۔ لیکن کیلاش کے کچھ نہ کرنے کا سبب ان کے والد کی کمائی دولت نہیں تھی۔ اس فیصلہ میں ان کے اپنے طرز فکر کو زیادہ دخل تھا۔ ان کا یہ خیال تھا اور ہے کہ جو خاندان پشت در پشت کمانے ہی میں لگا رہے گا تو یقیناً اس کا زوال ہوگا۔ اور اس خاندان کے افراد میں ذہانت نام کو بھی نہیں رہ جائیگی

ان کے خیال کے مطابق ذہانت وفہم کی حفاظت اسی وقت ہو سکتی ہے جب ایک پشت کمائے دوسری کھائے اور صرف مزے اڑائے اور تیسری پشت پھر کمانے پر لگ جائے۔

اگر کوئی دوست ان خیالات کی وجہ سے کیلاش کو سنکی یا خبطی کہتا ہے تو کیلاش کو غصہ نہیں آتا۔ وہ بہت سکون اور فکر کی گہرائی کے ساتھ ایسے لوگوں کو یہ جواب دیتے ہیں: "ہو سکتا ہے میں سنکی ہوں۔ میری پیدائش دلّی میں ہوئی اور یہیں میں پلا ہوں۔ بہر حال پھر بھی دیہاتی زندگی سے میرا خاص لگاؤ رہا ہے اس لئے ایک بات پوچھوں گا۔ کیا کبھی کسی کسان سے آپ نے یہ پوچھا ہے کہ زمین کو زرخیز بنائے رکھنا ہو تو کیا کرنا چاہیئے۔ وہ فوراً ہی یہ جواب دے گا۔ کہ یا تو فصل بدل کر بوئی جائے۔ یا چھ ماہ کے لئے زمین خالی چھوڑ دی جائے۔ کتنی آسان بات ہے۔ بس یہی حال دماغ کا ہے۔ تیس چالیس سال بعد اگر ایک خاندان میں ایک نوجوان آٹے دال کی فکر سے آزاد ہو کر اپنی خوشی سے غور وفکر میں لگا رہیگا تو بلاشبہ اس کی آنے والی نسل کی ذہنی صحت اچھی رہے گی۔ خیالات بلند رہیں گے۔ اور ذہانت محفوظ رہے گی۔ بس میری یہی درخواست ہے۔"

کیلاش کی ان باتوں سے کچھ لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور کیلاش کو سست وکاہل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ درحقیقت کیلاش کاہلی جیسی چیز سے کوسوں دور ہیں۔ انھیں پڑھنے کا شوق ہے۔ اور منصوبہ کے مطابق کام کرنے کی عادت۔ میں تو ان کو عالم مانتا ہوں۔ جنوب کی زبانوں کو چھوڑ کر دوسری ہندوستانی زبانیں وہ خوب جانتے ہیں۔ رس گلے والے سے وہ ٹھیٹ بنگالی میں بولتے ہیں۔ پارسی دوستوں سے وہ گجراتی میں بات کرتے ہیں۔ اور مہاراشٹر سماج میں انہیں لوگوں کی زبان میں گپ کرتے رہتے ہیں جب ان کی اس مہارت وقابلیت کا پتہ چلا تو یہ سب زبانیں سیکھنے کے لئے میرا دل بھی للچایا۔ میں نے کیلاش سے التجا کی کہ کبھی مجھے بھی بنگالی مراٹھی وغیرہ سکھاؤ۔ وہ بولے: "یہ کونسی بڑی بات ہے۔ "کوئنکر اوٹس کھایا کرو۔ کچھ ماہ میں ہی سب زبانیں آجائیں گی (کوئنکر اوٹس = مہر بند ڈبوں میں

جوکادلیا)

"مذاق رہنے دو" میں جھنجھلا کر بولا۔ "اگر سکھا سکتے ہو تو بتاؤ۔ نہیں تو رہنے دو"

"مذاق کون کر رہا ہے؟ میں نے تو زبانیں سیکھنے کا تمہیں وہی نسخہ بتلایا ہے۔ جس سے میں نے سیکھا ہے یقین کرو یا نہ کرو۔ یہ تمہاری مرضی۔ جب سے میں نے کوئکر اوٹس کھانے شروع کئے ہیں یہ سب زبانیں مجھے آگئیں۔ جب تک اوٹس کا دلیہ پکتا اور ٹھنڈا ہوتا ہے میں گول ڈبے پر لکھی زبانوں کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہندی کی مدد سے انہیں سمجھ لیتا ہوں۔ پھر لکھنے کی مشق کرتا ہوں۔ ہر زبان کی ایک ایک مثال لی اور غور سے پڑھی پھر تو یہ زبانیں بھلائے بھی نہیں بھولتا"

کیلاش کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ اصل میں یہ زبانیں انھوں نے کوئکر اوٹس کے ڈبوں سے ہی سیکھی تھیں۔ میں نے خود بھی یہ تجربہ کیا۔ کیلاش جیسی تو نہیں پر کچھ کامیابی ضرور ملی۔ بھلا جس آدمی نے ڈبوں اور شیشیوں پر لگے اشتہاروں سے کئی زبانیں سیکھ لیں اسے آپ کاہل کیسے کہہ سکتے ہیں؟

کیلاش میں ایک اور خوبی ہے۔ وہ مہربانی اور ہمدردی کرنا سب سے بڑا نیک کام مانتے ہیں پھر انہیں جذباتیت سے سخت دشمنی ہے۔ جذباتی آدمی سے وہ ہنسکر بات کرنے تک کو تیار نہیں۔ جذباتیت کو وہ بہت سی برائیوں۔ گناہوں اور غلطیوں کی بنیاد مانتے ہیں۔ اصولی طور پر وہ بھیک مانگنے کے سخت مخالف ہیں۔ بھیک مانگنے اور بھیک دینے والوں کو گالی دیتے انہیں میں نے بہت سی بار سنا ہے۔ چاندنی چوک میں بہت سے بھکاریوں کو دیکھ کر وہ بولے:۔ "میرا بس چلے تو ان سب کے کوڑے لگاؤں۔ ان میں سبھی تو لنگڑے لولے نہیں۔ پھر بھی انہوں نے حرام خوری پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اس برائی کو کم کرنے کا ایک طریقہ یہی ہے کہ سب کو پولیس کے حوالہ کر دیا جائے۔ چار دن حوالات میں رہیں گے تو سیدھے ہو جائیں گے"

یہ تلخ تقریر کیلاش نے ختم ہی کی تھی کہ میلے کچیلے کپڑے پہنے ایک بڈھا سامنے آ کھڑا ہوا اور ہاتھ پھیلا کر کچھ بڑبڑانے لگا۔ کیلاش پھر ابل پڑا، "یہ کیا مذاق کر رکھا ہے تم لوگوں نے۔ محنت اور کوئی کام ہی پسند نہیں۔ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو ہی پیشہ سمجھ بیٹھے ہو۔ بھاگو یہاں سے نہیں تو ایسا دھکا دوں گا کہ سڑک پر جا کر گروگے۔"

بڈھا واقعی سڑک پار کر بھاگتا دکھائی دیا۔ کیلاش کے دھکے کے ڈر سے نہیں۔ بلکہ کیلاش جی نے غصہ میں آ کر جو اکنی پھینکی تھی اسے اٹھانے کے لئے۔ اس طرح کی تلخ گفتگو کیلاش کو قریب سے دیکھنے والوں کو ان کی زندگی میں نظر آتی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ کیلاش جی کے دل میں اچھے اور نیک خیالات تھے ہی نہیں وہ سچے ایماندار تو ہیں ہی۔ ساتھ ہی سیدھے بھی ہیں۔ جو کام کرنا ہے وہ اسے گھما پھرا کر نہیں۔ بلکہ اسے فوراً اور سیدھے طریقے سے انجام دینے میں یقین رکھتے ہیں۔

تقسیم کے زمانہ میں جب دلی رنگ بدل رہی تھی۔ میرا اور کیلاش جی کا کئی دن تک ساتھ رہا۔ ایک دن ایک دوست کو سوار کرانے ہم ریلوے اسٹیشن پر گئے۔ میں اور کیلاش ادھر کئی روز سے اسٹیشن نہیں گئے تھے۔ وہاں کا جو منظر ہم نے دیکھا۔ وہ بیان کرنا مشکل ہے۔ چاروں طرف مغربی پنجاب سے آئے شرنارتھی اٹے پڑے تھے۔ جن میں آدھے مریض دکھائی دیتے تھے۔ ہمیں کچھ منٹوں میں ہی درد و دکھ کی دیوی کے درشن ہو گئے۔ دوست کو گاڑی میں سوار کرا کیلاش جی کچھ شرنارتھیوں سے بات چیت کرنے لگے۔ جذباتی نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ دل ہی دل میں وہ کچھ عہد سا کرتے دکھائی دیئے۔ شرنارتھیوں کی درد بھری حالت سے متاثر دیکھ کر میں کیلاش کو کسی بہانے سے جلدی اسٹیشن سے باہر لایا۔

کیلاش نے اپنے جذبات کو چھپانا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔ تانگے میں بیٹھتے ہی مجھ پر برس پڑے "تم جیسا طوطا چشم بھی میں نے نہیں دیکھا۔ ہمارے لاکھوں بھائیوں پر ظلم کے پہاڑ

ٹوٹ پڑے ہیں۔ اور تمہیں گھڑی دیکھنے اور میل ملاپ بڑھانے کے علاوہ کچھ سوجھ ہی نہیں رہا۔ سنی س غریب کی بات جس کے پاس میں کھڑا تھا۔ بیچارہ پرسوں کا بال بچوں سمیت اسٹیشن پر پڑا ہے۔ ملتان کی طرف سے آیا ہے۔ اچھا خوشحال آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آج اس کی یہ بری حالت ہے۔" کیلاش کے خیالات کی لہر کو میں نے موضوع بدلتے ہوئے روک دیا۔ کچھ دنوں کے بعد دلی میں فسادات ہو گئے۔ ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے کچھ مسلمان دوست گھروں کو چھوڑ کر پرانے قلعہ چلے گئے ہیں۔ اس زمانہ میں گھر سے باہر نکلنا بھی خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ مگر کیلاش ان پابندیوں کو کب ماننے والے تھے۔ ان کے اصرار پر ہم موسلادھار بارش میں گھر سے نکل پڑے اور پیدل چلکر پرانے قلعہ پہونچے۔ گھنٹوں باہر کھڑے رہنے کے بعد قلعہ میں اندر جانے کو ملا۔ ہم لوگ سپاہی کے ساتھ بہت دیر قلعہ میں گھومے۔ کسی دوست کا پتہ نہ چل سکا۔ ناامید ہو کر باہر آہی رہے تھے کہ مولانا حمزہ پر میری نظر پڑ گئی۔ وہ آگے لپکے مجھ سے اور کیلاش سے لپٹ کر رونے لگے۔ یہ ڈرامہ دس منٹ تک چلتا رہا۔ حمزہ نے تو آنکھیں پونچھیں اپنی آواز درست کر لی۔ مگر کیلاش بابو برابر روتے ہی رہے۔ روتے روتے وہ حمزہ سے لپٹ گئے۔ اور بولے "بلا کی بارش ہو رہی ہے۔ آپ اس کھلے میں کیسے رہ رہے ہوں گے۔ آپ تو اس قلعہ پر شعر لکھا کرتے تھے۔ اب اس کی دیواریں آپ کی حالت پر آنسو بہاتی ہیں۔"

"دیواریں ہی نہیں میاں"، حمزہ چونک کر بولے: "ان گھوڑ سالوں کی چھتیں بھی برسوں سے آنسو بہا رہی ہیں۔ تین دن سے کوئی سوکھی چیز دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ سب طرف جل تھل دکھائی دیتے ہیں۔ تیرا یا بیرم خاں میں اپنا گھر یاد آتا ہے تو دل کی حالت اور بھی خراب ہوتی ہے۔ پھر میں سوچنے لگتا ہوں۔ کس کا گھر۔ اب نہ وہ گھر تیرا نہ دلی تیری اور نہ یہ وطن تیرا۔" یہ الفاظ کہتے کہتے حمزہ دھڑ سے زمین پر گر پڑے۔ کیلاش نے انہیں اٹھایا اور ہم مولانا کو اٹھا کر بھیڑ سے علیحدہ ایک طرف لے گئے۔ کچھ دیر بعد حمزہ کو ہوش آیا۔ اور انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ کیلاش کو اس سے

بڑا سنتوش ہوا۔ اور حمزہ سے لپٹ کر بولے :۔ " بھائی جان کیا واقعی تم اس ملک سے جانے کی سوچ رہے ہو۔ تم تو یہ کہا کرتے تھے دلّی سے جس کا دل اکتا گیا وہ یقیناً موت کا طلبگار ہے۔ اب تمہیں آنکھیں پھیر گئے۔ ہم لوگ تم میں سے کسی کو بھی جانے نہیں دیں گے۔"

حمزہ کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔ رندھی ہوئی آواز سے بولے :" میاں کیلاش اب جتنی کم بات چیت کی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں اور تم تو ناچیز و حقیر ہیں۔ یہ طوفان ہمیں کب بچا سکنے لگا ہے۔ وہی دلّی جسے دیکھنے ترک اور پٹھان قافلے راستہ طے کر کے آتے تھے۔ اب ناسور بن گئی ہے۔" ہنوز دلّی دور است " یہ الفاظ ان کی ہمت باندھتے تھے۔ اور وہ منزل طے کئے جاتے تھے۔ اب انہیں لوگوں کی اولاد دلّی کے بارے میں کیا کہے گی۔ یہی نا " ہنوز دلّی نیست"۔

یہ ساری بحث بے سود سمجھ میں نے کیلاش کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے حمزہ سے اجازت چاہی۔ کیلاش نے اپنی برساتی انہیں دیدی۔ اور حمزہ نے جو چیزیں مانگی تھیں ان کو شام تک پہنچانے کا وعدہ کر ہم لوگ پرانے قلعہ سے باہر آ گئے۔ کیلاش کے دل میں طوفان امڈ رہا تھا۔ اگر میں ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ گھر کا راستہ بھول جاتے۔ کہیں اور ہی جا نکلتے، وہ بار بار کہتے " دنیا کیسی انقلابی ہے" اور پھر ایکدم چونک کر مجھ سے پوچھتے۔ پر کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ لاکھوں آدمی اپنا گھر بار چھوڑ کر کہیں چلے جائیں "

میں انہیں ان کے اس سوال کا جواب دیتا انہیں ان کے ان بہت سے اصولوں کی یاد دلاتا جن میں جذباتیت کے لئے کوئی مقام نہ تھا۔ اس طرح خیالات میں ڈوبے اور بہت کم بولتے ہم گھر آ گئے۔

(۱۸)

تاریخی عمارتیں یا شرنارتھی گھر؟

دلّی اپنی تاریخی عمارتوں کے لئے صدیوں سے مشہور ہے۔ اس شہر پر شاہوں اور شاہی خاندانوں کی ہمیشہ سے ہی مہربانی رہی ہے۔ پانڈوں نے یہاں بہت بڑا قلعہ بنایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعہ کے آثار پر مسلمان بادشاہوں نے ایک اور قلعہ بناکر کھڑا کردیا جو آج پرانے قلعہ کے نام سے مشہور ہے۔ مسلمانوں کو دلّی سے خاص محبت تھی۔ ہر ایک بادشاہ کی یہ خواہش رہی کہ اپنی زندگی میں ہی کم از کم ایک یادگار تو بنوا ہی دیں جس سے تاریخ میں ان کا نام امر ہو جائے۔

دلّی کو پچھلی دس صدیوں سے پورے ملک یا کسی چھوٹے بڑے صوبہ کی راجدھانی ہونے کا افسوسناک فخر حاصل رہا ہے۔ افسوسناک اس لئے کہ زمانۂ وسطیٰ میں کسی بھی شہر کا راجدھانی ہونا پھولوں کی سیج نہیں تھا۔ کم از کم راجدھانی کے رہنے والوں کے لئے تو وہ کانٹوں کا تاج ہی ثابت ہوتا تھا۔ اُن دنوں شہروں کی غیر معمولی سجاوٹ و شان اتنی ہی خطرناک مانی جاتی تھی جتنی قافلوں کے ساتھ چلنے والے مسافروں کو ڈاکوؤں کا ڈر ہوتا ہے۔ ویسے ہی راجدھانی کو حملہ آوروں کا ڈر رہتا تھا۔ اس لئے دلّی کو راجدھانی

ہونے کی وجہ سے مسلم دورِ حکومت میں تکلیفیں زیادہ اور آرام کم ملے۔

آرام اور سکھ اٹھانے والے تو خوش قسمت جدید دلی میں رہنے والے ہیں۔ ان تاریخی یادگاروں کی وجہ سے ہی شمالی ہندوالوں کے لئے دلی باعثِ کشش رہی ہے۔ دلی کی سیر کرنے والوں میں سبھی قسم کے شامل ہیں۔ اسکول کے طالب علم جن کے لئے تاریخ ۔ راجاؤں اور ان کے وزیروں کی فہرست سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان یادگاروں کو دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ تاریخ کا علم بھی حاصل کر سکتے ہیں جس نے ہمایوں کے مقبرہ میں دو گھنٹے گذارے ہوں اس کے لئے یہ یاد رکھنا آسان ہوجاتا ہے کہ مغل خاندان میں ہمایوں کا کیا مقام تھا ۔ وہ کس کا بیٹا تھا۔ کس کا والد اور کس کا دادا ۔ بڑے بوڑھوں کے لئے تاریخی یادگاریں تفریح کا ذریعہ ہیں ۔ عمارتوں کے علاوہ کھلے باغ اور پیڑوں کی گھنی چھایا کم از کم دلی میں اس قدر سستی ہے اور کہاں ملے گی جتنی ان یادگاروں میں ۔ اگر کوئی گھومنے والا شوقین گرمی کی دوپہر میں فیروز شاہ کوٹلہ ۔ صفدر جنگ ۔ قطب وغیرہ جانے کی ہمت کرے تو اس کو شطرنج ۔ چوپڑ اور تاش کے ایسے کھلاڑی ملیں گے جن سے ٹکر لینا آسان نہیں ۔

مگر یہ تو پرانی باتیں ہیں ۔ ملک کی تقسیم کے اثرات ان پرانی یادگاروں پر ان کی وسعت کے مطابق ہی پڑے ہیں ۔ جب لاکھوں شرنارتھی دلی میں آگھسے تو نئے پرانے کا فرق ختم ہوگیا ۔ مکانوں کی کمی نے تاریخی عمارتوں کو بھی مکانوں کا روپ دیدیا ۔ ایک خیال سے یہ ٹھیک ہی ہوا ۔ تاریخی عمارتوں اور شرنارتھیوں میں گہرا رشتہ ہے ۔ لال قلعہ اور قطب جیسی یادگاریں اگر تاریخ کی یادگاروں کو زندہ رکھتی ہیں تو شرنارتھی خود تاریخ ساز ہیں ۔ جو کام طاقتور بادشاہوں نے ان وسیع یادگاروں کے ذریعہ اپنی مرضی اور خواہش سے کیا وہی کام بے غریب اور بے سہارا شرنارتھی اپنی مرضی کے خلاف اپنے گھروں کو چھوڑ کر اور ان یادگاروں کو آباد کر کے کر رہے ہیں ۔

پچھلے ہفتہ میں پرانے قلعہ گیا ۔ یہاں ہر سال بسنت کے دن میلہ لگتا تھا ۔ دس بجے سے شام تک بڑی رونق رہتی تھی ۔ اس دن بسنتی کپڑے پہنے سینکڑوں خاندان دوپہر کا کھانا پرانے قلعہ میں ہی کھاتے تھے کہیں پکوڑے تلے جاتے تھے ۔ کہیں لڑکیاں بیڈمنٹن کھیلنے کے بہانے دوڑتی بھاگتی دکھائی دیتی تھیں اور کہیں

کچھ سنکی گھاس پر لیٹے کچھ سوچا کرتے تھے۔ شام کے وقت پیار و محبت کے ساتھ کھانا پینا ہوتا تھا۔

پرانے قلعہ میں ۱۹۴۲ء میں بسنت میلہ آخری تھا۔ کچھ دنوں بعد ہی اطالوی جنگی قیدی اس میں مقید کئے گئے۔ تین سال تک یہ سفید فام قیدی پرانے قلعہ کے سایہ میں رہے۔ ان جنگی قیدیوں سے چھٹکارا پالینے کے بعد پرانا قلعہ ذرا سنبھلنے لگا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں ایک اور مصیبت آگئی۔ کئی مہینوں تک اس میں پاکستان جانے کے خواہشمند مسلمان رہتے رہے جیسے ہی وہ رخصت ہوئے تو اس کے وسیع صحنوں اور بے شمار کوٹھڑیوں پر پاکستان سے آئے تازہ واردان کی نگاہ پڑی۔ مرضی یا بلا مرضی سینکڑوں شرنارتھی خاندانوں نے پُرانے قلعہ میں ڈیرے ڈال دیئے۔ سال بھر تک تو یہ لوگ خیموں اور دیوار کے سہارے بنی گھوڑسالوں میں ہی رہے۔ مکانوں کی کمی برابر موجود رہنے کی وجہ سے خیموں کی جگہ اینٹوں کے گھر بنا دیئے گئے۔

میں پچھلے ہفتہ پرانے قلعہ تقریباً دو برس بعد گیا تھا اس کے میدان میں اِدھر اُدھر بکھرے گھر مجھے ایسے لگے جیسے کسی جبڑے میں اونچے نیچے دانت۔ مگر کیا کیا جائے۔ لوگوں کو سر پر چھت تو چاہیئے ہی۔ خیمہ بھلے ہی دیکھنے میں خوبصورت لگتے ہوں مگر دھوپ اور بارش سے کہیں حفاظت کر سکتے ہیں؟

ہمایوں کے مقبرہ کا حال بُرا دیکھا۔ یہ دلّی کا مشہور تفریحی مقام تھا۔ اتوار کے دن یہاں خوب بھیڑ رہتی تھی۔ اب یہ بھی چھوٹا سا شرنارتھی نگر بن گیا ہے۔ یہاں خاص مقبرہ اور دوسری عمارتوں میں بہت سے کمرے ہیں۔ پاس ہی جمنا کی طرف نیلے گنبد والا مقبرہ ہے جو ہمایوں کے حجام کا بتایا جاتا ہے۔ تین سال پہلے جب سیاح اسے دیکھتے تھے تو اس پر ہنسا کرتے تھے کہ مغل بادشاہ بھی کیسے دیوانے تھے کہ حجام کی سرمالش سے خوش ہو کر اس کا مقبرہ بھی شاہ کے مقبرہ کے بغل میں بنوا بیٹھے۔ مگر اس مقبرہ کے گنبد میں جو چار خاندان آرام سے رہ رہے ہیں وہ اس کے بنانے والے کو دیوانہ نہیں بلکہ دوراندیش کہیں گے۔ ہمایوں کے مقبرہ میں ایک بچوں کا اسکول ہے۔ ایک چھوٹا سا اسپتال، کچھ دکانیں اور ایک راشن کا ڈپو۔ جہاں گائڈ اجنبی مسافروں کو بڑے شوق سے مغلوں کی تاریخ کی بہت سی بنا لکھی باتیں بنایا کرتے تھے۔ وہاں آج شرنارتھی ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھے مونجھ کی رسیاں بانٹتے دکھائی

دیتے ہیں۔

صفدر جنگ کا حلیہ بھی کم نہیں بدلا۔ اس یادگار کے کھلے باغ اور ہوادار مقبرے دیکھنے والوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ سترھویں صدی کے ان تعمیر کرنے والوں کو ان کی دور اندیشی پر داد ضرور دیں۔

بستی کی آدھی آبادی بچوں پر مشتمل ہے۔ املتاس کے ڈنڈوں سے یہ بچے ہمیشہ کھیلتے دکھائی دیتے ہیں۔ عورتوں کو ایک دو دستکاری سکھا دی گئی ہے۔ یہ کیمپ صرف بچوں اور عورتوں کے لئے ہے۔ صفدر جنگ میں ٹھہرے ہوئے لوگوں کو آج کل لاجپت نگر لے جایا جا رہا ہے لیکن اپنی مرضی سے کوئی نہیں جا رہا ہے مجبور ہو کر یہاں سے لوگ قدم اٹھاتے ہیں۔ امید ہے ایک دو ماہ میں صفدر جنگ خالی ہو کر پھر سے تاریخی یادگار بن جائے گا۔

جب شہر سے دور دو یادگاروں کا یہ حال ہے۔ تو پھر فیروز شاہ کوٹلہ کا تو کہنا ہی کیا، جو دریا گنج کے قریب ہی ہے۔ یہاں کھنڈروں اور میدانوں کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ دو سال پہلے یہاں سینکڑوں خیمے لگا دیے گئے تھے جن میں شرنارتھی جوں توں کر کے گذر کرتے تھے۔ پھر بھی بہت سے لوگ اصطبل نما کھنڈروں میں جا گھسے تھے ان اصطبلوں میں جہاں حملہ آوروں سے لوہا لینے کے لئے شاہی فوجیں جمع ہوتی تھیں آج وہاں آرام کی تلاش کرنے والے پرامن شرنارتھیوں کی قطاریں ہیں۔ پچھلے سال خیموں کی جگہ کچی بارگیں بن گئی ہیں۔

فیروز شاہ کوٹلہ میں ایک صاحب میرے دوست بن گئے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے اعتبار سے وہ ایک ٹیچر ہیں اور بارہ سال تک پاکستان میں بچوں کو پڑھانے کے سوا انہوں نے کچھ اور نہیں کیا۔ مگر ہندوستان میں انہیں درزی کا کام پسند آیا۔ آج کل اچھی خاصی پتلونیں سیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان یادگاروں کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ جہاں مردہ شاہوں اور ان کی اولاد کو یہاں مستقل آرام کا حق ہے وہاں کیا زندہ انسانوں کو عارضی آرام کا بھی حق نہیں؟ ایسی مُلا کی داس جی کی دلیل ہے۔

(۱۹)

راجدھانی کے اسکول

دلّی کی ایک کہاوت ہے کہ جس نے پڑھائی پر سوا سیر اناج سے زیادہ خرچ کیا وہ عقلمند نہیں۔ دلّی کے رہنے والوں میں زیادہ تر کاروباری پیشہ لوگ ہیں۔ تھوڑا بہت لکھتے پڑھتے تھے۔ ان میں سے بہت سوں کی تعلیم صرف مُنڈی تک ہی محدود تھی۔ یہ منیم گری زبان دس دن میں آجاتی ہے۔ اس کے لئے سوا سیر اناج کی بھیک کم نہیں۔

خیر یہ تو پرانی بات رہی ہوگی۔ ادھر بیسویں صدی میں کچھ خوشحال خاندان اپنے بچوں کو پڑھانے لگے تھے۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ دس سال ہوئے دلّی کے اسکولوں اور کالجوں میں تین چوتھائی طالب علم یا تو باہر کے تھے یا نئی دلّی میں رہنے والے سرکاری ملازمین کے بچّے تھے۔ دلّی کے پرانے رہنے والوں میں ایسے لوگ بہت کم تھے جو اپنے بچوں کو اسکول بھیجتے ہوں۔ بہت سے پڑھائی سے دور ہی رکھنا پسند کرتے تھے۔ اور کچھ رئیس دور کی روایات کے مطابق گھر پر مولوی صاحب، یا پنڈت جی کو بلا کر تعلیم کا مسئلہ حل کر لیا کرتے تھے۔

کچھ بھی سہی دلّی کے اسکول کبھی اچھے نہیں مانے گئے۔ تعلیم۔ کھیل کود یا انتظام کسی بھی نقطہ نظر سے یہاں کے اسکول اچھے نہیں تسلیم کئے جا سکتے تھے۔ ہاں عیسائیوں نے گرجا گھروں کے ساتھ جو اسکول کھول رکھے تھے وہ کافی اچھے تھے۔ پر ان میں کسی بھی درجہ کی فیس پانچ روپیہ ماہانہ سے کم نہ تھی۔ (آج ان اسکولوں کی فیس بڑھتے بڑھتے تیس روپیہ ماہوار ہو گئی ہے) اس لئے ان انگریزی اسکولوں میں گنے چنے امیر لوگوں کے بچّے ہی پڑھ سکتے تھے۔

پرائمری اور ابتدائی اسکولوں کا حال تو بہت برا تھا۔ دو چار کو چھوڑ کر سبھی پرائمری اسکول ایک ہی کمرہ میں سما جاتے تھے۔ ان میں سے بہت سے تنگ اور گندی گلیوں میں واقع تھے۔ ۱۹۴۰ء میں پل بنگش میں ایک پرائمری اسکول میں نے کسی رئیس کے اصطبل میں دیکھا ہے۔ چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی جہاں ٹاٹ پر بچّے بیٹھتے تھے وہاں رئیس صاحب کی فٹن لاکر کھڑی کر دی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ سالوں چلتا رہا۔ ان اسکولوں میں داخلہ کا کوئی سوال نہ تھا۔ جب کوئی چاہے ان میں داخل ہو سکتا تھا۔ ان کے دروازے بارہ مہینے کھلے رہتے تھے۔ پھر بھی جتنے نئے لڑکے سال بھر میں آتے تھے اس سے زیادہ درمیان میں ہی پڑھائی چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔

دوران جنگ اسکولوں کی حالت میں کچھ سدھار ہوا۔ ہوتا بھی کیسے نہیں۔ بڑے لاٹ کے دفتر کو ہی دیکھیئے۔ کہاں تو جنگ سے پہلے اس میں چھ ہزار آدمی کام کرتے تھے اور اب ۱۹۴۴ء میں یہ تعداد بڑھ کر چالیس ہزار سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ سبھی تنخواہ پانے والے اپنے بچّوں کو پڑھانا چاہتے تھے انہیں تعلیم کا شوق تھا۔ اور ان میں پڑھانے کی ہمت بھی تھی۔ اس لئے لڑائی کے زمانہ میں اسکولوں کی ویرانی ختم ہو گئی۔ تقریباً سبھی اسکولوں میں طلبار کی تعداد بڑھ گئی۔ نئی دلّی اور کشمیری گیٹ کے اسکولوں میں تو کافی سدھار بھی ہوا۔ اب کسی کسی اسکول میں بھیڑ تک دکھائی دینے لگی۔

شرنارتھیوں کا سیلاب آنے پر دلی کے اسکولوں پر کیا گذری۔ اس کا تصور آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اگر دلی کے تمام اسکول پنجاب اور سندھ سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کے لئے ہی خالی کر دیئے جاتے تو ان لوگوں کے بچوں کے لئے یہ ناکافی رہتے۔ ایسی صورت میں دلی کے اسکولوں کی ناقابل رحم حالت کا آسانی سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو اسکول صرف آٹھ لاکھ کی آبادی کے لئے کافی تھے ان سے بھلا سولہ لاکھ آدمیوں کا کام کیسے چل سکتا تھا۔ اور یہ معاملہ خالص ریاضی ہی کا نہیں۔ پہلے کے دلی کے رہنے والوں اور نوواردوں میں بڑا فرق ہے۔ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے دلی میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بچوں کو اسکول بھیجتے ہی نہیں تھے۔ مگر پاکستان سے جو شرنارتھی آئے ان میں بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے بچوں کو پڑھانا نہ چاہتے ہوں۔ اس لئے بھی اسکول جانے والے بچوں کی تعداد بڑھ گئی۔

ان سب وجوہات سے پچھلے دو سالوں میں دلی کے اسکولوں کا وہی حشر ہوا جو سیلاب کے وقت ندیوں کا ہو جاتا ہے۔ دو ماہ کے انتشار اور بدنظمی کے بعد جب نومبر ۱۹۴۷ء میں لوگوں کو بچوں کی پڑھائی کا خیال آیا تو اسکول کی عمارتیں شرنارتھیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جیسے تیسے جنوری ۴۸ء تک حکومت نے شرنارتھیوں کو ادھر ادھر بھیج اسکول کی عمارتیں خالی کرائیں۔ اسکول پھر سے کھل تو گئے۔ پر پڑھائی کے آثار کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ جس اسکول میں دو سو لڑکے پڑھتے تھے وہاں چار سو جا پہونچے۔ اور جس کمرہ میں تیس طلبا کی جگہ تھی وہاں پچاس سے زیادہ آگھسے۔ ایسی ریل پیل میں پڑھائی کا کیا کام۔ پھر بھی جو کچھ ہو سکتا تھا کیا گیا۔ ہر اسکول میں زیادہ سے زیادہ طلبا داخل کئے گئے۔ جب اس سے بھی کام نہ چلا تو اسکولوں میں دو نشستوں (Double Shifts) میں تعلیم ہونے لگی۔ پہلی نشست صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک اور دوسری دو سے سات تک۔ سبھی اسکولوں کو چار چاند لگ گئے۔ چھٹی کے بعد جہاں مکھیاں بھنبھنایا کرتی تھیں۔

وہاں چہل پہل لڑکے لڑکیوں کی چہل پہل رہنے لگی۔ پڑھائی کا سلسلہ ختم ہوتے ہی ہزاروں شرنارتھی اپنا چادر تکیہ بغل میں دبا اسکولوں کے برآمدوں یا باہر ہری گھاس پر لوٹ لگانے کے لئے آپہونچتے۔

سال بھر تک یہ سب کچھ چلتا رہا۔ اب سبھی پرائمری اسکولوں میں جگہ کی قلت بری طرح محسوس ہورہی تھی۔ شرنارتھی باہمت انسان تو ہے ہی۔ انہوں نے ہر بستی میں اپنے اسکول کھول دیئے انہیں اپنے رہنے تک کے مکان نہیں مل رہے تھے۔ ایسی حالت میں اسکولوں کے لئے عمارتوں کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ کھلے میدانوں میں گھنے پیڑ کی چھایہ میں۔ ٹین یا گھاس پھوس کے چھپروں کے نیچے جہاں بھی جگہ ملی وہیں بیس پچیس بچوں کو اکٹھا کر پڑھائی کا کام شروع کر دیا گیا۔ طلبا وطالبات فطرت کے براہ راست تعلق کی وجہ سے خودرو پھولوں کی طرح ہنستے کھیلتے پھرتے تھے پھر بھی ان کے چاروں طرف کا ماحول انہیں تلخ حقائق کا احساس دلاتا رہتا تھا۔ ہوا کا ہر جھونکا اور موسم کی ہر کروٹ بچوں کے لئے جگہ بدلنے کا پیغام لاتی تھی۔ سورج چڑھنے کے ساتھ بچے پیڑوں کی کھسکتی چھایا سے فائدہ اٹھانے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے مقام بدلتے رہتے تھے۔ ان اجڑے اور بے سہارا لوگوں کی تعلیم کے تئیں یہ دلچسپی دیکھ کر راہ چلتے سبق لیتے تھے۔ آزاد ہندوستان کے ان نونہالوں کو دیکھ کر میں اور کیلاش دسیوں بار سائیکل سے اترے ہیں۔

قرولباغ میں جہاں دو لاکھ سے اوپر شرنارتھی رہتے ہیں بیس سے بھی زیادہ پرائیویٹ اور پرائمری اسکول ہیں۔ اسی طرح پہاڑ گنج۔ سبزی منڈی۔ لودی روڈ اور دوسری شرنارتھی بستیوں میں درجنوں بچوں اور بالغوں کے اسکول کھل گئے ہیں۔ ان میں سبھی طرح کے اسکول شامل ہیں۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جن کا کوئی خاص مقام نہیں۔ گرمیوں میں پیڑوں کے نیچے اور سردیوں میں کھلے میدانوں میں لگتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو چار یا زیادہ کمروں کے فلیٹ میں ہیں۔ پرائمری اسکولوں میں کئی ایک انگریزی ڈھنگ کے ہیں جن میں مونٹسری اور کنڈر گارٹن کے اصولوں کے مطابق تعلیم ہوتی ہے۔

بنیادی تعلیم کے اُصول پر بھی کچھ اسکول چل رہے ہیں۔

ان سبھی اسکولوں میں پڑھانے کا کام زیادہ تر شرنارتھی خواتین ہی کرتی ہیں۔ یہ تعلیمی مراکز باہمی تعاون۔ محنت اور لگن کے زندہ نمونے ہیں۔ ان میں کوئی سرکاری امداد پر منحصر نہیں۔ جہاں ان اسکولوں سے ہزاروں بچوں کی تعلیم کا کام چل رہا ہے۔ وہاں ان کی وجہ سے دو چار ہزار ٹیچر اور ٹیچریس کو کام بھی مل گیا۔

تعلیم بالغان کا مسئلہ کچھ نئے اسکول کھولکر اور موجودہ اسکولوں میں دو شفٹوں کا انتظام کر کے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر یہ بات قطعی درست ہے کہ چھوٹے بڑوں سبھی کی تعلیم سرکار اور دلّی کارپوریشن کے لئے ایک زبردست اُلجھن بنی ہوتی ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور ذرائع آمد و رفت نہ ہونے کی وجہ سے دس میں سے سات اسکول چھوڑنے والے بالغ مقامی یونیورسٹیوں میں داخلہ نہیں لے پاتے ہیں۔ جن میں یونیورسٹیوں میں داخلہ کی استطاعت ہے ان سبکو بھی داخلہ نہیں مل سکتا ہے۔ اس لئے دلّی میں ایک کالج مشرقی پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے چل رہا ہے۔ پچھلے سال اس کالج میں تین ہزار طلبا پڑھتے تھے۔ یہ کالج ایک مقامی اسکول میں شام کے وقت لگتا ہے۔ کیونکہ دن کے وقت وہاں اسکول کے طلبا پڑھتے ہیں۔ اس کا نام بھی کسی نے ٹھیک ہی رکھا ہے۔ اسے کیمپ کالج کہتے ہیں۔

●●

(۲۰)

کچھ کھانے پینے کی باتیں

کٹرہ نیل کے رہنے والے میرے پرانے دوست کیلاش چندر جی کا ہمیشہ یہ اصرار رہتا تھا کہ میرا جب دلّی آنا ہو تو میں انہیں کے یہاں ٹھہروں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا! ایک تو کیلاش کا مکان اتنا بڑا اور خوبصورت تھا کہ اسے سبھی حویلی کہا کرتے تھے۔ دوسرے کٹرہ نیل ریلوے اسٹیشن سے چار قدم پر ہے۔ اس لئے میں نے ہمیشہ ان کی پیش کش کا شکریہ کے ساتھ خیر مقدم کیا۔

ایک بار ۱۹۳۵ء میں دلّی آنا ہوا۔ مئی کا مہینہ تھا غضب کی لُو چل رہی تھی۔ آٹھ بجے کے قریب میں کیلاش کے گھر پہنچا۔ نہانے اور کھانے سے فارغ ہو کر دس بجے ہی مجھے باہر جانا پڑا۔ پھر میں ایک بجے گھر لوٹا۔ کیلاش جی اپنی بیٹھک میں سفید چاندنی پر بیٹھے میری راہ دیکھ رہے تھے۔ ۱۵۔ ۲۰ منٹ پنکھے کے نیچے بیٹھنے کے بعد جب کچھ جان میں جان آئی تو میں نے پینے کیلئے پانی مانگا کیلاش جی نے کھڑکی کی طرف منہ بنا کر آواز لگائی: "لڑکے! دو ٹھنڈے گلاس پینے کے لیتے آؤ۔" کچھ دیر بعد ایک لڑکا دو گلاس بادام کی ٹھنڈائی کے لے آیا۔ اسے پیتے ہی میری تمام گرمی ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد کیلاش جی نے اپنے پینے کے لئے بھی کچھ منگایا۔

اور پھر وہی بادام کی ٹھنڈائی آئی۔

میں نے حیران ہو کر اپنے دوست سے پوچھا: "کیا آپ کے یہاں دن بھر بادام ہی رگڑے جاتے ہیں۔ جب دیکھو تب پانچ منٹ کے نوٹس میں ٹھنڈائی کا گلاس چلا آتا ہے۔"

کیلاش ہنس کر بولے: "گھر میں بادام رگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ محلے میں جتنے تنبولی اور شربت والے ہیں سبھی کے یہاں شام کے پانچ بجے تک ٹھنڈائی مل سکتی ہے۔

۱۹۳۵ء ۱۹۳۶ء تک بھی دلی میں گرمی کے موسم میں بادام کی ٹھنڈائی ہی سب سے زیادہ مقبول مشروب تھا۔ جہاں آج کل پنواڑیوں اور شربت والوں کی دکان پر سوڈا واٹر کی لال اور ہری بوتلیں ہی دکھائی دیتی ہیں وہاں پہلے دن میں ہر وقت بادام بھیگے رہتے تھے۔ گاہکوں کے آتے ہی وہ لوگ فوراً بادام رگڑ کر ٹھنڈائی تیار کر دیتے تھے۔ کئی دکانوں پر خس۔ فالسہ۔ بادام۔ نیلوفر وغیرہ شربت بھی ملتا تھا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے سوڈا واٹر کا بہت ہی کم رواج تھا۔

کیلاش جی بھی آج کل آئے گئے کو سوڈا واٹر ہی پلانے لگے ہیں۔ پچھلے دنوں جب انہوں نے میرے سامنے ارغوانی رنگ کا گلاس پیش کیا تو میں نے پینے سے انکار کر دیا اور بادام کی ٹھنڈائی کی مانگ کی۔ کیلاش جی نے کہا: "دیکھو دوست۔ کچھ دیر رُکنا پڑے گا۔ وہ دن دُور گئے جب تنبولی بادام رگڑا کرتے تھے۔ اب تو گھر میں بادام توڑ کر بھگونے پڑیں گے اور جب چھیلنے کے لائق ہو جائیں گے تبھی ٹھنڈائی بن سکے گی۔"

میں نے رنجیدہ لہجہ میں پوچھا: "ایسا کیوں! کیا بادام بھی گھی کی طرح کافور ہو گئے ہیں۔" جواب ملا: "آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں۔ آج کل بادام کون پیتا ہے۔ گیس بھری سوڈا واٹر کا ہی رواج ہے۔ اس چھوٹے سے محلہ میں ہی سوڈا واٹر کی چار مشینیں ہیں۔ جھٹ سے بوتل کھولی۔ گلاس میں انڈیلی اور گاہک کے حوالے۔ بادام رگڑنے کا جھگڑا آج کون کرتا ہے۔ ایک دو روایت پسند آج بھی بادام رگڑتے ہیں۔

مگران کے پاس مشکل ہی سے کوئی گاہک پھنستا ہے کیونکہ بادام کی جگہ یہ بھلے آدمی خوبانی اور آڑو کے بیج رگڑنے لگے ہیں۔"

بحث کرنا بیکار سمجھ میں ارغوانی رنگ کا وہ سوڈا واٹر چپ چاپ پی گیا۔ لیکن میں گھنٹوں سوچتا رہا کہ ان دس بارہ سالوں میں دلی کتنی بدل گئی۔ ٹھنڈائی اور جل جیرے کا ہی چلن نہیں اٹھ گیا۔ کھانے پینے اور تواضع کے بھی طریقوں میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ پہلے صبح ہوتے ہی سب لوگ گرم کچوری یا بیوڑی اور حلوہ کا ناشتہ کرتے تھے۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ جو یہ چلن اب نہیں رہا۔ اگر آج کل کوئی اصول سے بازار کا حلوہ اور کچوری کھائے تو وہ دن بھر نمک کے پانی کے غرارے کرتا پھرے گا۔ آج کل بھی خوشحال حضرات صبح ہوتے ہی چائے کے ساتھ ٹوسٹ کا ناشتہ کرنا پسند کرتے ہیں۔ درمیانی درجے کے لوگوں کو چھوڑیے۔ غریبوں تک کے گھروں میں ڈبل روٹی اور چائے پہنچ گئی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کٹرہ نیل میں سب سے پہلے حلوائیوں کی دکانیں کھل جایا کرتی تھیں۔ کیونکہ انہیں محلہ بھر کے لئے ناشتہ تیار کرنا ہوتا تھا۔ وہ ان کی جگہ چھوٹے چھوٹے چائے گھروں اور ہوٹلوں نے لے لی ہے۔ نو وارد شرنارتھی بھائیوں میں اب تک کافی ایسے ہیں جو ناشتہ میں صبح ہی دہی کی لسی پینے پر زور دیتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ان لوگوں کو بھی دہی کا پیچھا چھوڑ چائے کے پیالے پر ہی قناعت کرنی پڑے گی۔

دلی کے پراٹھے تو سچ مچ ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ایک وقت وہ تھا جب لوگ پراٹھوں والی گلی کے پراٹھے شوق سے کھاتے ہی نہ تھے بلکہ دو چار پراٹھے رومال میں باندھ کر گھر بھی لے جاتے تھے۔ اب پراٹھوں کا چلن نہیں کے برابر ہے۔ اتنا کم کہ دیر سویر کارپوریشن کو اس گلی کا نام بدلنا پڑے گا۔

دلی کا ایک اور طوفان یہاں کی چاٹ ہوا کرتی تھی۔ مجھے بہت سے ایسے دن یاد ہیں جب میں نے کھانے کی بجائے چاٹ سے پیٹ بھرا۔ جیب میں پیسے ہوں۔ صحت ٹھیک ہو اور چاندنی چوک میں چاٹ کھانے بیٹھ جاؤ۔ تو پھر اٹھنے کا کیا سوال۔ ایسی یہاں کی کہاوت تھی۔ آج کل تواضع و مہمان نوازی کا معیار کچھ اونچا ہو گیا ہے۔ چاٹ والے کی دکان پر بیٹھنا لوگ اچھا نہیں سمجھتے ہیں۔ شریف آدمی وہی ہے جو صاف ستھرے

ہوٹل میں بیٹھ کر ناشتہ کرے۔ جو باہمت لوگ ہیں اور اب بھی دکان یا ریڑی کے سامنے کھڑے ہو کر کھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں انہیں بھی اب چاٹ کا کوئی شوق نہیں رہا۔ وہ آلو چھولے یا چھولے کچولے زیادہ شوق سے کھاتے ہیں۔ شرنارتھی جوانوں نے اپنا رواج یہاں بھی نہیں چھوڑا ہے۔ ان کے لئے جگہ جگہ شامی اور سیخ کے کباب موجود ہیں یہ تو رہی کھانے پینے کی بات۔ سماجی رسم رواج میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ وہ بھی کم حیران کن نہیں ہیں۔ پچھلے سال مجھے اپنے ایک دوست کے یہاں مبارکباد دینے جانا پڑا۔ ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تھا۔ وہاں اور بھی کئی حضرات موجود تھے۔ کسی نے بسکٹوں کا ڈبہ نذر کیا، کسی نے چاندی کا جھنجھنا۔ لیکن بہت سوں نے دو روپیہ سے دس روپیہ تک نقد پیش کئے۔ میرے وہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی ایک خاندانی دلّی والے وہاں آپہونچے۔ سفید رومال سے ڈھکی طشتری سے رومال اٹھایا۔ طشتری میں کچھ پان آٹھ دس چھالیاں اور کچھ بادام تھے مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ میں دلّی کے رسم و رواج سے واقف تھا۔ مگر اور دوسرے لوگوں کی پیشانی پر بل پڑگئے۔ ایک صاحب نے تو ہنسی میں کہہ ہی ڈالا :-

"واہ صاحب! خوب تحفہ لائے ہیں۔ آپ نے ناحق تکلیف کی۔ ان چھالیوں اور باداموں کو کون توڑتا پھرے گا۔" مجھے یہ بُرا لگا۔ میں نے سب لوگوں کو دلّی کے رسم و رواج سمجھانے کی کوشش کی۔ اور کہا غریب سے لے کر راجہ تک دلّی والوں کے یہاں بیٹا ہونے کی خوشی میں پان چھالی ہی نذر کرنے کا رواج رہا ہے۔ میری صفائی کا ان لوگوں پر جو اثر ہوا اس کے بارے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں۔ وہ لوگ تو دو یا پانچ روپیہ کے نوٹ ہی کے قائل تھے۔

بیاہ شادیوں اور نام رکھنے کی رسم کے موقعوں پر آج کل دلّی میں جو کچھ ہوتا ہے ان میں اور دلّی کے پرانے رواجوں میں کوئی میل نہیں۔ پہلے ہاتھ کی بنی چیزیں کا مدار کپڑے۔ خوبصورت چاندی کے یا مرادآبادی برتن۔ دلیسی سنگاردان۔ عطردان وغیرہ پیش کرنے کا رواج تھا۔ آج کل نقدی پر ہی زور ہے۔ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق روپیہ دے کر ہی زیادہ تر لوگ پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ لینے والے

کو بھی اس میں آسانی ہے۔
آج کل دلّی میں کونسے کھانوں کا رواج ہے اور کونسے رسم و رواج چل رہے ہیں اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ آج کل تو دلّی بھان متی کے کنبہ سے کم نہیں ہے۔ دیش کے کسی بھی کونے میں جو رواج ہے وہ دلّی میں بھی مل جائے گا۔ اب دلی ایک عظیم شہر ہے۔ اس نے یہ عظمت اپنی مخصوص خوبیوں کو کھو کر پائی ہے۔

(۲۱)

اخلاق وآداب۔ موسم اور رئیس زادے

اس بدلتی ہوئی دنیا میں دلّی بھی گرگٹ کی طرح کس طرح بدلی ہے۔ اس کا سب سے اچھا ثبوت یہاں کے موسم سے ملتا ہے۔ دلّی۔ اتر پردیش۔ پنجاب اور راجستھان کے درمیان واقع ہے۔ ان تینوں صوبوں کے جغرافیہ کا اثر دلّی پر بھی رہا ہے۔ اتر پردیش کی طرح برسات کے موسم میں دلّی میں کافی بارش ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ پنجاب کی سردی و گرمی کا تجربہ بھی دلّی والوں کو رہا ہے۔ ادھر ریگستان کی لو اور آندھیاں سدا دلّی کو اپناتی رہی ہیں۔

کوئی یقین کرے یا نہ کرے۔ دلّی میں اور بہت کچھ تو بدلا ہی ہے ان دس بارہ سالوں میں یہاں کے موسم بھی بدل گئے ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ کوئی بھی پیش گوئی کر سکتا تھا کہ جولائی کے شروع میں یا اس کے آس پاس دلّی میں بارش شروع ہو جائے گی۔ آجکل برسات کے بارے میں ایک عام آدمی تو کیا کوئی پیش گوئی کرے گا۔ ماہر موسمیات کا علم بھی انہیں دھوکا دے جاتا ہے۔ اخباروں میں موسم کا حال کبھی کبھی حقیقت کے اسقدر برعکس ہوتا ہے کہ اخبار میں دیا گیا بادلوں سے گھرا موسم کا حال

کسی عاشق ہجر کی آرزو سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی جولائی کا پورا ماہ کورا نکل جاتا ہے۔ اور ایک دو سال ایسا کبھی ہوا ہے کہ مئی کے مہینہ میں ہی ساون کی رُت آگئی۔

دلّی میں تین مہینہ اپریل۔ مئی۔ اور جون سخت گرمی کے ہوا کرتے تھے۔ مئی میں جھلس دینے والی لو چلا کرتی تھی۔ لو کے ساتھ ہی کبھی کبھی سبزی منڈی اور قرولباغ جیسے محلوں میں ریت بھی اڑا کرتی تھی۔ لو اب بھی چلتی ہے۔ مگر سانس لے کر۔ چار دن لو چلی کہ آکاش میں بادل اُمڈ آئے۔ مہینہ چاہے مئی کا ہو یا جون کا۔ لو کے ساتھ اب ریت اڑنے کا تو کوئی سوال نہیں۔ دلّی میں ریت بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ اتنی تھوڑی کہ جسے آندھی طوفان ہی اڑا سکتے ہیں۔ اس لئے ان دنوں گرمی کا قدرتی عذاب کم ہو گیا ہے۔

مجھے یاد ہے۔ دو سال ہوئے مئی کے مہینہ میں دلّی میں واقع امریکی سفارت خانہ میں ایک صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ جو دو دن پہلے واشنگٹن سے آئے تھے۔ اس دیش میں ان کا پہلی بار آنا ہوا تھا۔ مجھ سے بار بار ہندوستان کی سیاسی حالت پر سوال کرتے رہے۔ اچانک میں نے پوچھ لیا: "کہئے مسٹر بلیک! آپ کو دلّی کیسی لگی؟" بلیک صاحب بولے: "بہت اچھی۔ ہم کو واشنگٹن میں ہی بتلایا گیا تھا کہ دلّی ایک خوبصورت پہاڑی پر واقع ہے۔ پہاڑی تو میں نے ابھی تک دیکھی نہیں لیکن پرسوں سے پہاڑی موسم کا لطف ضرور اٹھا رہا ہوں۔"

اگلے ہی دن جب کڑاکے کی دھوپ نکلی۔ اور تیز لو چلی تو بلیک صاحب کی خوش فہمی ہوا ہو گئی۔ واشنگٹن میں ملی معلومات پر انہیں غصہ آنے لگا۔ کچھ ہفتے بعد جب میں ان سے ملنے گیا۔ تو پتہ چلا وہ مسوری گئے ہوئے ہیں۔

کم و بیش یہی حال یہاں کی سردی کا ہے۔ کبھی کبھی سردی اسقدر زور پکڑتی ہے کہ شرنارتھیوں کو لاہور کی یاد آجاتی ہے۔ لیکن اس سال موسم کے راجہ کا استقبال گرمی نے کیا۔ اور

فروری میں ہی آگ برسنے لگی۔ شوقین لوگ چار ہی روز ٹھنڈے سوٹ پہن پائے تھے کہ سردی نے چھپے رہزن کی طرح ایک دم پھر حملہ کیا، مارچ کے پورے مہینہ لوگ سردی سے ٹھٹھرتے رہے۔

دلّی کی اس بدلتی آب و ہوا کے لوگ کئی سبب بتلاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ عالمگیر جنگ میں جو گولہ بارود اور گیس فضا میں پھیلی تھی اس کا اثر آجکل کے موسم پر پڑ رہا ہے۔ سی پی ڈبلیو ڈی کے افسران گرمی کی مدت کم کرنے کا سہرا اپنے سر باندھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے دلّی میں اسقدر درخت لگا دیئے ہیں کہ یہاں کا موسم ہی بدل گیا ہے۔ ماہرین موسمیات سمجھتے ہیں راجستھان کا ریگستان دھیرے دھیرے اژدھا کی طرح دلّی کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کی وجہ سے دلّی کا موسم غیر یقینی ہو گیا ہے۔ ان بیچارے لوگوں کا خیال ہے آگے پچاس سالوں میں دلّی بھی جے شلمیر سی بن جائے گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سولن اور رانی کھیت کی برابری کرنے لگے۔ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو بشمولیت موسم سبھی تبدیلیوں کے لئے مختلف صوبوں سے آئے شرنارتھیوں کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

صدیوں سے دلّی کا اخلاق و آداب ایک مخصوص قسم کا رہا ہے۔ یہاں کے آداب کی بنیاد ہے دوسروں کی عزت کرنا اور سماج کی خدمت کرنا۔ دلّی کی زبان میں سخت الفاظ کا استعمال ممنوع تھا۔ کسی کی بات کو درمیان میں کاٹنا بہت برا مانا جاتا تھا۔ لیکن بات کاٹنے والے پھر بھی بہت سے تھے۔ یہ کام وہ ڈھنگ سے کرتے تھے۔ اس کے لئے نیا گر ڈھونڈ لیا گیا تھا۔ اگر کسی کی بات درمیان میں کاٹنی ہو تو نہایت ادب سے جھک کر عرض کیا جاتا تھا: "قطع کلام معاف" مطلب تھا "میں آپ کی بات کاٹ رہا ہوں، معاف کیجئے۔" کسی کو بھلا برا کہنا ہو وہ بھی سلیس اور صاف شہری زبان میں نبھایا جاتا تھا۔

محفل یا مجلس کے آداب بالکل مختلف تھے۔ مجلس میں کیسے بیٹھا جائے۔ کون کہاں

بیٹھے۔کچھ مانگنا ہو تو کیسے مانگا جائے۔ بیچ میں اٹھنا ہو تو رخصت کی اجازت کیسے لی جائے۔ یہ سب اخلاق وآداب کے دائرہ میں آتا تھا۔ پان پیش کرنا یا کھانے وغیرہ کی چیز کسی کو دینا۔ پیش کردہ چیز کو قبول نہ کرنے کے لئے مجبوری کا اظہار کرنا یہ بھی مجلس آداب کے ضروری اجزار تھے۔

اخلاق وآداب کی تعلیم لڑکے لڑکیوں کو بچپن سے ہی دی جاتی تھی۔ جتنا پڑھنے لکھنے پر زور تھا۔ آداب پر اس سے کم نہ تھا۔ کچھ امیر گھرانوں میں تو خاندانی روایات کے ذریعہ ہی اخلاق وآداب کی تعلیم حاصل کر لیتے تھے۔ بہت سے ایسے رئیس ہوتے تھے جن کے گھروں میں روایات کم اور رئیسی زیادہ ہوتی تھی، ایسے گھروں میں رئیس زادے اخلاق وآداب سیکھنے کے لئے طوائفوں کے سپرد کئے جاتے تھے۔ اٹھنا۔ بولنا۔ بات کرنا آنے والوں کا استقبال کرنا۔ بڑوں کو سلام کرنا، اوران کی خدمت کرنا، یہ سب سبق رئیس زادوں کو طوائفیں پڑھاتی تھیں۔ اس تعلیم کی بنیاد کافی گہری تھی۔ ایک زمانہ تھا جب بازار سیتارام کی گلی مرغان (جسے اب گلی بجرنگ بلی کہتے ہیں) اس طرح کے مدرسوں کے لئے مشہور تھی۔ شام کے وقت اس گلی میں جگہ جگہ رئیس زادوں کی فٹنیں یا گھوڑا گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔

ممکن ہے یہ سب سن کر آجکل کے نوجوانوں کے منہ میں پانی بھر آئے۔ فن وآرٹ کے اس ماحول میں تعلیم پانا دلّی والے فخر کی بات سمجھتے تھے۔ مگر ان سب باتوں کو دلّی کے لوگ بھول چکے ہیں۔ دلّی کے شام کے کالجوں کو دیکھ کر مجھے کبھی کبھی گلی مرغان کی پاٹھ شالاؤں کی یاد آجاتی ہے، اگرچہ وقت کے علاوہ ان دونوں باتوں میں مماثلت کچھ بھی نہیں۔

(۲۲)

دلّی اور اُردو ادب

اُردو ادب کا ذکر کیے بنا دلّی کی کہانی نامکمل ہی نہیں بلکہ بے رس ہے۔ کیونکہ دلّی ہی اردو ادب کا گھر ہے۔ اسی کی گود میں اس نے اپنا بچپن اور جوانی گذارے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک متنازعہ فی مسئلہ ہے۔ لیکن پھر بھی اسقدر تو سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ اُردو ادب کی ترقی اور بقا میں دلّی کا خاص ہاتھ رہا ہے۔ شاید ہی اُردو ادب کی کوئی ایسی تاریخ ہو جس میں دلّی کو گہوارہ ادب نہ کہا گیا ہو۔

اس دعویٰ کے پیچھے جذباتیت نہیں ہے اور نہ ہی یہ بات ہے کہ دلّی مغل سلطنت کی راجدھانی رہی ہے۔ اس کا خاص سبب تو یہ ہے کہ اردو زبان اور ادب کے خالق دلّی ہی کے رہنے والے تھے۔ اردو نثر کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ اردو کی کتابیں جو مقبول عام ہوئیں۔ اور جنہیں عالموں کے علاوہ معمولی اردو جاننے والوں نے بھی پڑھا۔ صرف ستر اسّی سال پرانی ہیں۔ ان کتابوں کے لکھنے والے تھے سر سیّد احمد خاں۔ مولوی ذکا اللہ۔ ڈپٹی نذیر احمد۔ اور غالبؔ وغیرہ۔ یہ سب دلّی کے رہنے والے تھے۔ تعزیرات ہند کا پہلا اُردو ترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد نے کیا تھا

اس کے بعد انھوں نے کئی ناول لکھے جو دلچسپ ہی نہیں بلکہ اردو ادب میں ان کا معیار کافی بلند ہے۔

سرسید احمد کی کتابوں کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ تو اردو نثر کے سب سے پہلے کامیاب نثر نگار مانے جاتے ہیں۔ غدر کے بعد مسلمانوں کی خستہ حالت کے بارے میں اور اپنی قوم کو پستی سے ابھارنے کے لئے انہوں نے جو کچھ لکھا اس کا مسلمانوں پر کافی اثر پڑا۔ ان کے مضامین ہی اردو نثر کی بنیاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جس پر اردو ادب کا عظیم الشان محل تعمیر کیا جا سکا۔

یہی نہیں اردو زبان اور ادب کی پہلی تاریخ بھی دلّی میں ہی لکھی گئی۔ کتاب کا نام ہے "آب حیات" اور اس کے مصنف ہیں دلّی کے ہی رہنے والے محمد حسین آزاد۔ اسی زمانہ میں (سن ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ) اردو ادب کی ایک اور تاریخ لکھی گئی۔ جس کے لکھنے والے ایک ہندو لالہ شری رام تھے۔ یہ حضرت بھی ٹھیٹھ "دلّی والے" تھے۔

اور تو اور اردو کے پہلے لغت کی تخلیق بھی دلّی میں ہوئی۔ لغت کا نام تھا فرہنگ آصفیہ اور اس کو لکھوانے والے تھے مولوی سیّد احمد دہلوی۔

اردو نظم کے میدان میں تو دلّی نے اور بھی کمال کیا ہے۔ سبھی استاد اور اہل نظم دلّی میں ہی موجود ہوئے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ رہا ہو کہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر خود ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ ان کی غزلیں آج بھی اردو ادب کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔ ذوقؔ۔ مومنؔ۔ غالبؔ۔ داغؔ وغیرہ جو اردو شاعری کے انمول رتن تھے دلّی ہی میں رہتے تھے۔ انہیں شاعروں کی وجہ سے اردو شاعری معیار کی بلندیوں پر پہونچی۔ انھیں کے کلام نے اردو شاعری کو مقبول عام بنایا۔

کس کس بات کو گنایا جائے۔ اردو ادب تو وہ مشین کہی جا سکتی ہے جس کا ہر کل پرزہ دلّی ہی میں ڈھالا گیا۔ یہیں گھڑا گیا۔ اور یہیں پر فٹ کیا گیا۔ اس ادب کے بھی اجزا کو یہاں کے لوگوں نے

اپنایا اور آگے بڑھایا ہے۔ یہ سب باتیں ۱۸۷۰ء سے ۱۹۰۰ء تک کی ہیں۔ اب آگے چلیئے اور بیسویں صدی پر ایک نظر ڈالیئے۔ اس صدی کے آغاز تک اردو ادب زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ دلی کے علاوہ لکھنؤ۔ حیدر آباد۔ لاہور بھی اردو کے مراکز بن گئے تھے۔ پھر بھی دلی کی زمین تو زرخیز ٹھہری۔ یہاں کے ادیب اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو ادب کے خزانہ میں برابر اضافہ کرتے رہے۔ اس بات کو سبھی تسلیم کرتے تھے کہ اردو ادب کا بنیادی مرکز دلی ہی ہے۔ اس لئے انجمن ترقی اردو کا بڑا دفتر حیدر آباد سے دلی لایا گیا۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی دوسری سرگرمیوں کا مرکز بھی دلی ہی کو مانا گیا۔

بیسویں صدی کے صف اوّل کے اُردو خادموں میں خواجہ حسن نظامی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ یزدانی۔ میر۔ ناصر۔ نذیر۔ فراق اور راشد الخیری ہیں۔ یہ تو بڑے اعلیٰ پیمانے کے قلم کار تھے۔ ان کے علاوہ اور درجنوں ادیب۔ شاعر وغیرہ ہیں جو دلی سے وابستہ تھے اور ہیں۔ مندرجہ بالا شخصیتوں میں سے صرف خواجہ حسن نظامی کو چھوڑ کر باقی سبھی اب ماضی کا فسانہ بن چکے ہیں۔ حسن نظامی نے پورے پچاس برس تک لکھا ہے۔ (یہ مضمون ۱۹۵۰ء میں لکھا گیا تھا) اب بھی شاید وہ لکھتے رہتے ہیں۔ شاید بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے اب وہ خود نہیں لکھتے خود بولتے جاتے ہیں اور کوئی دوسرا لکھتا ہے۔

دلی کو سمجھنا اور جاننا ہو تو حسن نظامی صاحب سے تعارف حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر آپ واقعی دلی جاننے کے بارے میں سنجیدہ ہیں تو صرف تعارف سے کام نہیں چلے گا۔ خواجہ صاحب سے اچھی طرح جان پہچان بلکہ دوستی کی ضرورت ہے۔ خدا میرے دوست حمزہ کو عمر خضر عطا کرے۔ ان کی مہربانی سے مجھے خواجہ صاحب سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ پہلی ملاقات کیسے ہوئی یہ لطف کی بات ہے۔ تفصیل سے سننا نامناسب نہ ہوگا۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مولانا حمزہ میرے دوست ہو گئے تھے، ہم اکثر ایک دوسرے

کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔ ایکبار شاید ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ شب برات کے دن حمزہ میرے گھر کچھ مٹھائی لائے اسی ڈلیا میں بسکٹ کا ایک پیکٹ بھی رکھا تھا۔ جس پر اردو میں لکھا تھا "اردو بسکٹ" اس پیکٹ کو دیکھ کر میں ہنسا۔ اور حمزہ سے پوچھا کہ یہ انہوں نے کہاں سے خریدا۔ مولانا بولے:۔ واہ جناب! آپ نے یہ لذیذ بسکٹ کبھی نوش نہیں فرمائے۔ یہ تو مشہور اردو بسکٹ فیکٹری کا تحفہ ہے۔"

"یہ بھی خوب رہی، کہاں ہے یہ فیکٹری؟" میں نے پوچھا۔

مولانا حمزہ نے جواب دیا: "اردو بازار کے نکڑ پر ہی چھوٹا سا پارک ہے نہ۔ جسے اردو پارک کہتے ہیں۔ ٹھیک اس کے سامنے بڑا سا بورڈ لگا ہے جس پر موٹے حروف میں لکھا ہے۔ "اردو بک ڈپو" اس کے پیچھے ہی اردو بسکٹ فیکٹری ہے۔"

اب مجھ سے ہنسے بغیر نہ رہا گیا۔ "یہ کیا رام کہانی ہے؟ اردو بازار۔ اردو پارک۔ اردو بسکٹ کیا یہ سب کچھ دلّی ہی میں ہے یا کہیں باہر؟"

"واہ حضرت! ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ دلّی سے واقف ہیں۔ تبھی آپ میری بات پر ہنسے۔ جامع مسجد کے سامنے ہی یہ اردو بازار ہے۔ یہ سارا کرشمہ خواجہ حسن نظامی کا کیا ہوا ہے۔ اردو بک ڈپو اور اردو بسکٹ فیکٹری کے وہی مالک ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ ان سے کبھی نہیں ملے۔ نہیں تو یہ راز کب کا کھل گیا ہوتا۔ بہت سے دوست تو خواجہ حسن نظامی کو بھی "خواجہ اردو" کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔"

یہ پر لطف بات سن کر میں اور بھی کھل کھلا کر ہنسا۔ ایسے دھن کے پکے انسان کے دیدار تو ضرور کرنے چاہئیں۔ میں نے سوچا۔ حمزہ کے ہمراہ اسی روز میں نظام الدین پہونچا۔ اور خواجہ صاحب سے ملاقات کی۔ گئے تھے ایک گھنٹہ کے لئے۔ مگر وہاں لگ گئے چار گھنٹے۔ باتچیت

میں بڑا لطف آیا۔ مجھے ان سے بات چیت کر کے پورا یقین ہو گیا کہ دلّی میں گفتگو کرنے میں خواجہ صاحب کی ٹکر کا دوسرا آدمی نہیں ہے۔ وہ جیتی جاگتی تاریخ ہیں۔ ایک کہانی ہیں۔ انھوں نے بہت پڑھا ہے اور کوڑیوں کتابیں لکھی ہیں۔ اردو ان کی زندگی کا مفہوم بن گئی ہے۔ انہوں نے ہمیں کئی لطیفے اور قصے سنائے جنھیں سن کر ۱۸۵۷ء کے غدر سے لے کر ۱۹۳۶ء میں لارڈ لنلتھگو کے وائسرائے بننے تک کی پوری تاریخ نگاہوں میں گھوم گئی۔ جیسی سلیس با محاورہ اردو خواجہ صاحب لکھتے ہیں۔ ویسی ہی بولتے بھی ہیں۔ سننے والا دل ہی دل میں گھبرانے لگتا ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ وہ اچانک خاموش ہو جائیں۔

دوسرے صاحب جن کے بارے میں میں کچھ کہنا چاہوں گا مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں انہوں نے غدر سے پہلے اور بعد کی دلّی کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ پڑھتے وقت اس دور کے سماج کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ غدر سے پہلے کے واقعات کے بارے میں ان کی معلومات کی بنیاد ذاتی تلاش و تحقیق یا سنی سنائی باتوں پر ہی ہو سکتی ہے کیونکہ ان کی پیدائش ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہے۔ "دلّی کی آخری شام" میں بیگ صاحب نے بہادر شاہ کے دور کے آخری مشاعرہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ مشاعرے میں شاعر حضرات ایک ایک کر کے آرہے ہیں۔ بیگ صاحب لکھتے ہیں :-

"استاد ذوقؔ سب سے ملکر شامیانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مشاعروں میں شعرا کا بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین کی تعریف کروں گا کہ جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا۔ پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکایت نہ شکوہ۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں اس کے خیال میں اس کو نہ بیٹھنا چاہئے تھا۔ بجائے اس کے کہ اس کو وہاں سے اٹھاتے۔ خود ایسی جگہ جا بیٹھتے اور تھوڑی دیر

بعد کہتے :۔" ارے بھئی ذرا ایک بات تو سنو" وہ آکر ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ اس سے باتیں کرتے رہتے۔ اتنے میں کوئی اور شخص آجاتا۔ جس کو وہ خالی جگہ کے لئے موزوں خیال کرتے۔ اس سے کہتے" تشریف رکھیئے۔ وہ جگہ خالی ہے" جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے اٹھ جاتے۔ اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔"

اسی مشاعرہ میں مصنف نے ایک شاعر کا نقشہ یوں کھینچا ہے :۔" اب بائیں طرف کی شمع اٹھا کر عبداللہ خاں اوج کے سامنے رکھدی گئی۔ یہ بڑے پرانے چالیس پینتالیس برس کے مشاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں۔ مگر ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قلعہ میں بھی ان کی سمائی ممکن نہیں۔ اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپادیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے، بھلا دوسروں کو تو ان کے شعروں میں کیا مزا آئے۔ کوئی کیا داد دے۔ ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں خود ہی مزے لیتے ہیں۔ اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ جوش میں آکر صف مجلس سے گز بھر آگے نکل جاتے ہیں ان کے شاگرد تو دو چار ہی ہیں۔ مگر استاد بھی ان کو استاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا بل بوتا ہے جو ان کو استاد نہ کہکر مفت میں لڑائی مول لے۔"

خواجہ حسن نظامی کو چھوڑ کر یہ سب ادیب ۱۹۴۰ء تک دنیا سے رخصت ہو چکے تھے ۱۹۴۰ء کے بعد جو دور شروع ہوا اس کو دلّی کے لئے ترقی کا دور نہیں کہا جا سکتا۔ راشد الخیری۔ مولوی عبدالحق۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی وغیرہ پرانے حضرات برابر اردو کی خدمت کرتے رہے لیکن جو لوگ در حقیقت پنپے وہ آل انڈیا ریڈیو کی کشش سے دلّی میں باہر سے آئے حضرات تھے، بخاری آل انڈیا ریڈیو کے گویا مالک تھے وہ خود اعلیٰ درجہ کے ادیب ہیں۔ انہوں نے پنجاب کے سبھی اردو شاعر اور ادیب یہاں جمع کر لئے تھے۔ جو ممتاز شاعر یہاں آئے ان میں راشد۔ میراجی۔ فیض۔ ڈاکٹر تاثیر۔ ہری چند اختر۔

حفیظؔ جالندھری اور حسرتؔ قابل ذکر ہیں۔ کہانی کاروں میں مشہور منٹو۔ اور کرشن چندر ہیں۔ اس طرح لڑائی کے زمانہ میں آل انڈیا ریڈیو نے دلّی میں اچھی خاصی رونق بڑھائی ہوئی تھی۔ اگرچہ انہوں نے زیادہ تر ریڈیو کے لئے لکھا۔ پھر بھی اس سے اردو ادب کے خزانہ میں تو اضافہ ہوا ہی۔

جنگ ختم ہوتے ہی ریڈیو نے پلٹا کھایا۔ ساتھ ہی اردو کا تخت بھی ہل اٹھا۔ یہ بھی جانتے تھے کہ ریڈیو پر جو اہمیت اردو کو دی جارہی تھی وہ نامناسب تھی اور اس کو مستقل نہیں کہا سکتا تھا۔ ہندی کی مخالفت کا ردعمل ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء سے ہی ہندی کو زیادہ جگہ ملنے لگی۔ دیش کی تقسیم نے تو اردو کو بالکل ہی ختم کر دیا ہے لیکن یہ بات بالکل صاف ہے کہ اگر ملک تقسیم بھی نہ ہوا ہوتا تب بھی اردو ہندی کے چیلنج کا بوجھ نہ سہہ پاتی۔ آخر کار زبان کا مسئلہ لوگوں کو ہی تو طے کرنا تھا۔ اکثریت بلاشبہ کسی بھی وقت ہندی کے حق میں ہو سکتی تھی۔

آج جبکہ ہندوستان کی قومی زبان ہندی کو قرار دیا گیا ہے اردو کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ مگر اردو سے پیار کرنے والے آج بھی بہت ہیں۔ اردو ادب اور زبان بہت سی خصوصیات کے حامل ہیں جو بلاشک اسکو زندہ رکھ سکیں گی۔ کم از کم دلّی کے لوگ تو شاید ہی اردو کو بھول سکیں۔

مورخ تاریخ کی اس ستم ظریفی پہ ہنسے گا کہ وہی دلّی جس نے اردو کو انیسویں صدی میں جنم دیا۔ پال پوس کر بڑا کیا آج اس کی طرف سے لاپرواہ ہو چکی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ان دس سالوں میں دلّی بالکل بدل گئی ہے۔

(۲۳)

ماضی اور حال — ایک موازنہ

نئی دلّی میں ہنومان روڈ کے پیچھے ایک چھوٹا سا مندر ہے جو مقامی گوڈیہ مٹھ کا مرکز ہے۔ یہاں کچھ بنگالی سنیاسی رہتے ہیں جو تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔ ان میں کچھ حضرات تو متبحر عالم ہیں۔ ہندوستانی فلسفہ کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ خوش قسمتی سے میرا اس مٹھ (خانقاہ) سے کئی سال سے تعارف ہے۔ اور میں وہاں اکثر آتا جاتا رہتا ہوں تہواروں کے موقعوں پر یہاں اچھی تقریریں ہوتی ہیں۔ اور شاستروں کے بارے میں ذکر واذکار ہوتے ہیں۔ جن میں میری گہری دلچسپی ہے۔

پچھلے سال (۱۹۶۹ء) دیوالی کے موقع پر اس خانقاہ (مٹھ) میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ میں بھی وہاں پہونچا۔ کل پچاس کے قریب حضرات وہاں موجود تھے۔ سبھی اچھے تعلیم یافتہ تھے۔ کیرتن وغیرہ کے بعد شری چکرورتی کی تقریر ہونے والی تھی۔ تقریر کا موضوع تھا: "زندگی کا مقصد" شری چکرورتی مقامی کالج میں پروفیسر ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہنا شروع کیا اس سے سامعین تعجب میں پڑ گئے۔ سب لوگ مقرّر کی طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ شری چکرورتی کہہ رہے تھے: "حضرات! زندگی کا

اصل مقصد وہ ہے جو ہمیں روزانہ کی زندگی میں سچے کاموں کی طرف لے جائے۔ اور جو سدا ہمارے سامنے موجود رہے۔ اور ہمارے کاموں پر اثرانداز ہوتا رہے۔ میں صاف اور سچ بات کہوں گا۔ لاگ لپیٹ کی بات نہیں کروں گا۔ میرا ذاتی مقصد آجکل صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جتنی میری آمدنی ہے میں اسی میں گذراوقات کر سکوں۔ اور ادھار مانگنے کی کسی طرح نوبت نہ آئے۔ آجکل دلّی کے کسی بھی گرہستی کے لئے یہ اونچے سے اونچا آدرش ہے۔ یہی صالح عمل ہے۔ سچائی ہے اور اسی میں خوداعتمادی پوشیدہ ہے۔"

شری چکرورتی اس نئی خوداعتمادی کی تعریف کر ہی رہے تھے کہ مٹھ کے صدر نے درمیان ہی میں ٹوک دیا: "پروفیسر صاحب! یہ آج کونسے فلسفہ کا بیان ہو رہا ہے آپ تو اپنی علمیت کے لئے مشہور ہیں۔ لوگ جو سننے کی امید لے کر آئے ہیں انہیں وہی دیجئے نا۔۔۔"

اس طرح درمیان میں ٹوکا جانا چکرورتی جی کو بہت برا لگا۔ وہ کچھ گرم ہو کر بولے: "دیکھئے جناب سادھو سنیاسیوں کی زندگی کے مقصد پر تو کوئی بحث ہو نہیں سکتی ہے۔ قابل بحث موضوع تو گرہستیوں کی زندگی کا مقصد ہے۔ میں اسی کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ میری یہ قطعی رائے ہے کہ کسی بھی مذہب پرست گرہستی کا آج کم از کم دلّی میں اس سے خوبصورت اور کوئی آدرش نہیں ہو سکتا کہ وہ اتنا ہی خرچ کرے جتنا کماتا ہے۔ سرکار کی مسلسل یہی خواہش رہی ہے کہ اس ملک کے عوام کا معیار زندگی اونچا اٹھے۔ واہ ری قسمت خدا نے ہمارے نیتاؤں کی ایسی سنی کہ عوام کا معیار زندگی کھجور کے پیڑ کی طرح بلند ہو گیا، علم معاشیات کے مطابق رہن سہن کا معیار اونچا ہوتے وقت تھوڑی تکلیف تو ضرور اٹھانی پڑتی ہے۔ دیر سویر عوام خود اونچا اٹھے گا۔ میرا کہنا ہے کہ یہ سب زبردستی کی بات ہے۔ اگر سب کو اس طرح زبردستی اوپر اٹھایا گیا۔ تو بہتوں کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔"

شری چکرورتی خوب بولے۔ میں نے کسی بھی مندر میں اسقدر خوبصورت تقریر کبھی نہیں

سنی کتنی سچی بات انھوں نے کہی، کیلاش جی میرے ساتھ تھے۔ اسقدر متاثر ہوئے کہ چلکر وتی سے بعد میں گھنٹوں بات چیت کرتے رہے۔

شام کے وقت سیر کرتے ہوئے میں اور کیلاش گھر واپس آ گئے۔ ہم برابر یہی سوچتے رہے کہ دلی میں رہنے والوں کا معیار زندگی کتنا بلند ہو گیا ہے۔ اپنے خیالات کو مثال کے ذریعہ ظاہر کرتے ہوئے کیلاش جی بولے: "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رہن سہن کے معیار اور قطب مینار میں مقابلہ ہو گیا ہو کہ دیکھیں کون کس سے اونچا رہتا ہے۔"

ہم دونوں ہنستے ہنستے پاگل ہو گئے۔ میں نے کہا: "دیکھو کیلاش! جب بھی تم آتے ہو۔ موجودہ دلی کا جنگ سے پہلے کی دلی کیساتھ مقابلہ کرنے لگتے ہو۔ تمہیں اچھا لطیفہ ملا۔ آج اس موضوع پہ خوب سیر ہو کر گفتگو کر لو۔ روز روز کا جھگڑا ختم ہو۔"

کیلاش نے میری بات منظور کی۔ اور پھر ایک بہت ہی عجیب لیکن دلچسپ راز پر یوں روشنی ڈالی: "تمہیں پتہ ہے نہ ہیمنت! میں دو ماہ ہوئے بمبئی گیا تھا۔ وہاں چار دن رہا۔ ایک بھی چیز نہیں خریدی۔ تو بھی میرے دو سو روپے خرچ ہوئے۔ تم یقین نہیں کرو گے ایک بار میں ۱۹۳۶ء میں بمبئی گیا تھا۔ تب بھی وہاں اتنے ہی دن ٹھہرا تھا۔ سو روپیہ کا میں نے سامان خریدا تھا۔ اسے نکالکر تم جانتے ہو میرا کیا خرچ ہوا تھا؟ یقین کرو چاہے نہ کرو میرے کل پچیس روپے خرچ ہوئے تھے۔"

میری بیوی یہ سن کر ہنس پڑی۔ اور بولی: "کیلاش جی آپ بھی غضب ڈھا رہے ہیں۔ مانا آجکل مہنگائی ہے مگر روپیہ کی دوّنی تو نہیں ہو گئی۔ آپ تو بڑھا چڑھا کر بات کر رہے ہیں۔"

کیلاش کو غصہ آ گیا، اور کاغذ پنسل نکال حساب لکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد بولا: "لو بھابی سن لو۔ اب تمہیں سمجھتی رہنا روپیہ کا کیا باقی رہا۔ میں نے پچیس روپے خرچ کئے تھے۔ ان کا حساب

اس طرح ہے۔ دلی سے بمبئی کا آنے جانے کا ریل کرایہ نوّے روپیہ (گھبراؤ مت۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں پتی دیو سے پوچھ لو۔ ان دنوں نوّے روپیہ میں جی آئی پی (حکومت "جہاں جی چاہے سفر کرو ٹکٹ" دیا کرتی تھی۔) تیسرے درجہ ہی میں بڑا آرام تھا۔ چار دن کا ہوٹل کا بل تھا، آٹھ روپے۔ اور باقی کے آٹھ روپے خرچ ہوئے تانگہ۔ بگھی۔ پان سگریٹ سینما وغیرہ پر اس سال اکتوبر میں جو دو سو روپیہ خرچ ہوئے ان کا حساب اس طرح ہے:۔

ریل کا دونوں طرف کا کرایہ ــ مبلغ ــ	۱۱۶ روپیہ
چار دن کا ہوٹل کا بل ــــــــ	۴۴ روپیہ
تانگا بگھی پان سگریٹ اور سینما ــــــ	۴۰ روپیہ
کل میزان	۲۰۰ روپیہ

اس میں غلطی دو چار روپیہ کی ہو تو ہو اس سے زیادہ بالکل نہیں۔ تھرڈ میں تو میں جا ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ گھر واپس آنے کی خواہش تھی۔ اب بھابی صاحبہ آپ ہی بتائیں میں نے اس میں کونسا غضب ڈھا دیا۔"

کیلاش کے اس حساب سے ہم بہت متاثر ہوئے۔ میری بیوی کو افسوس ہوا کہ بیچارے کو فضول ہی برا بھلا کہا۔ شریمتی جی نے بھی کچھ پرانے بل نکالے بہت سے ادھورے تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کا پورا حساب مل گیا جو اس طرح تھا۔

آٹا دو من۔ آٹھ سیر دالیں۔ نمک مرچ مصالہ وغیرہ	۹ روپیہ ــ ۰
ہری سبزیاں	۱۱ روپیہ ــ ۸
اصلی گھی ہریانہ کا ۱۵ سیر	۲۲ روپیہ ــ ۰
تیل سرسوں ڈھائی سیر	۱ روپیہ ــ ۰

پھل۔ انگور۔ سنگترے۔ کیلے شریفے وغیرہ	۱۶ روپیہ —	۰
چینی بیس سیر	۵ روپیہ —	۰
دودھ تین من	۱۵ روپیہ —	۰
ایندھن	۱۰ روپیہ —	۰
میزان	۸۹ روپیہ —	۸

یہ تھا ان دنوں کا حال۔ جب ہمیں فضول خرچ کہا جاتا تھا۔ اب سنئے اکتوبر ۱۹۴۹ء کا حال۔ مذکورہ ماہ کے بل اس طرح ہیں:-

آٹا دو من۔ دالیں آٹھ سیر نمک مرچ مصالہ وغیرہ	۲۸ روپیہ —	۰
ہری سبزیاں	۴۸ روپیہ —	۰
گھی ۱۵ سیر ونسپتی	۴۵ روپیہ —	۰
تیل سرسوں کا ڈھائی سیر	۵ روپیہ —	۸
چینی ۶ سیر	۴ روپیہ —	۱۲
دودھ تین من	۱۰۵ روپیہ —	۰
ایندھن	۲۹ روپیہ —	۱۲
پھل اب ہم کھاتے ہی نہیں جب تک کی بیمار نہ ہوں یا رونے بچوں کو چپ نہ کرانا ہو پھر کبھی پچھلے سال جو پھل خریدے گئے	۳۳ روپیہ —	۰
میزان	۲۴۸ روپیہ —	۱۲

ان اعداد و شمار کے موازنہ سے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو سامان ۱۹۳۹ء میں نوے روپیہ کا آتا تھا وہ اب ۲۹۹ روپیہ کا آتا ہے۔ یہ تو اس وقت ہوتا جب دونوں فہرستوں کا سامان ایک جیسا

ہی ہوتا۔ ایک فہرست میں اصل گھی ہے تو دوسری میں صرف ونسپتی۔ ایک میں روزانہ کھانے کے لئے پھل ہیں تو دوسری میں صرف روتے بچوں کو خاموش کرنے کے لئے کچھ پھل۔ اصل دودھ اور گھی تو اب دلّی میں ایک کہانی بن گئے ہیں بھلا سات روپیہ سیر گھی اور ایک روپیہ سیر دودھ کون خرید سکتا ہے بگڑے ہوئے پرانے رئیس یا اکیلے غیر شادی شدہ حضرات جن کے آگے نہ پیچھے کوئی وہی اب خالص دودھ گھی کھانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

کھانے کی چیزوں کو چھوڑیئے۔ اور سب خرچ بھی تو اسی تناسب سے بڑھ گئے ہیں مکانوں کا کرایہ (اگر خوش قسمتی سے مل جائے) تانگوں کا کرایہ۔ اسکولوں اور کالجوں کی فیس (اگر بچوں کو کوئی اپنے یہاں داخل کرنے کی مہربانی کرے) کپڑے کی قیمتیں وغیرہ وغیرہ کہیں سے کہیں جا پہونچی ہیں۔ ملازمین کا تو ایسا برا حال ہوا کہ سبھی شرنارتھی کہلانے کے خواہشمند نظر آتے ہیں۔

میں اور کیلاش ان خیالات میں کھوسے گئے۔ اچانک میری بیوی نے ایک بل نکالا۔ اور بڑے فخر سے اسے پڑھا۔ یہ اکتوبر ۱۹۴۹ء کا ہمارا پانی کا بل تھا۔ تیرہ روپیہ آٹھ آنے۔ یہ بات کمال کی رہی اب ہم نے گلا کرنا فضول سمجھا۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں ہم نے اصل دودھ تین من ۱۵ روپیہ کا خریدا تھا۔ اور اسی ماہ ۱۹۴۹ء میں ہم نے تیرہ روپیہ آٹھ آنے کا پانی خریدا۔ کیلاش بھی اس پر خوب ہنسے اور بولے "تو میاں کونسی بڑی بات ہوئی؟ پانی بھی تو ایک بڑی قیمتی شے ہے۔ اور پھر دودھ کے بل سے پانی کا بل اب بھی ڈیڑھ روپیہ کم ہی ہے"۔

بات تو ٹھیک ہے۔ میں نے کہا۔ اب الجھن آپ ہی سلجھ گئی۔ میری بیوی بل سنا کر چلی گئی۔ کیلاش کو نمستے کہہ میں بھی اپنے کمرے میں جا کر چپ چاپ سو گیا۔

●●

(۲۴)

زمانہ کی رنگینیاں

جو لوگ باہر کے رہنے والے ہیں اور پچھلے پندرہ بیس سالوں سے ہی دلّی میں آ بسے ہیں وہ بھی دلّی میں ہونے والی انقلابی تبدیلیوں سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ پھر بھلا ان لوگوں کا کہنا ہی کیا جو یہاں صدیوں سے رہ رہے ہیں اور جن کے آباؤاجداد کو دلّی کی شہرت، بلخ و بخارا سے یہاں کھینچ لائی تھی۔ دلّی میں ہزاروں ایسے خاندان تھے (ان میں سے بہت سے اب بھی یہاں ہیں) جن کے آباؤ اجداد یہاں مسلمان حکمرانوں کے بلائے ہوئے آئے یا خود ہی شمال مغربی پردیش کی بنجر اور پتھریلی زمین کو چھوڑ کر خوشحالی کی تلاش میں دلّی آ پہونچے۔ ایکبار جو دلّی آیا وہ یہیں کا ہولیا۔

مولانا حمزہ کی مہربانی سے ایسے کئی گھرانوں میں میرا آنا جانا رہا ہے۔ آج مجھے ان دوستوں کی یاد آتی ہے تو بیں بیچین ہو اٹھتا ہوں۔ ان میں سے زیادہ تر دلّی کو چھوڑ کر پاکستان جا چکے ہیں۔ میرے قابل فخر دوست حمزہ بھی انہیں میں شامل ہیں۔ ان میں سے صرف ایک شخصیت یہاں رہ گئی ہے۔ وہ ہیں سیّد فیاض حسین (ان سے میری آخری ملاقات نومبر ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ اس کے کچھ ماہ بعد انکا انتقال

ہوگیا۔ ۱۹۴۹ء میں حمزہ بھی دلّی چھوڑ کر کراچی چلے گئے تھے) وہ حمزہ کی مجلس کے سب سے پرانے رکن ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال کے قریب ہے۔ اگر تقسیم کے زمانے میں وہ یہاں ہوتے تو بے شک وہ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ پاکستان چلے گئے ہوتے۔ ان کا اس مقدس سرزمین پر رہ جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء میں آٹھ ماہ کے قریب اپنے بھتیجے کے یہاں حیدر آباد (دکن) میں تھے۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں وہ اگلے سال وہاں سے لوٹے۔ مہینوں ان کا من اچاٹ رہا۔ اکثر مجھ سے ملتے اور دل کی بات کرتے۔ میں نے اپنے پاس آنے سے انہیں روک دیا تھا جب ملنا ہوتا تھا تو وہ کہلوا بھیجتے تھے۔ یا خط لکھ دیتے تھے۔ اور میں ان سے ان کے گھر پر مل لیتا تھا۔ اب وہ بھی میرے گھر آنے لگے ہیں۔ کیونکہ مہینوں کچے پکے میں بھٹکنے کے بعد دلّی پھر سے راہ مستقیم پر آگئی ہے۔

پچھلے دنوں نومبر میں فیاض صاحب کافی بیمار رہے۔ ایک ماہ تک بستر سے اٹھ نہیں پائے۔ ان دنوں کئی بار میں ان کے یہاں گیا۔ ایک دن تو پانچ گھنٹے سے بھی زیادہ ان کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ کچھ بات کر رہے تھے۔ اچانک ان کا گلا رندھ گیا۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا۔ پر انھوں نے آنسو پونچھنے یا شرم سے مجھ سے مُنہ چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا: "بھائی جان کیا بات ہے۔ آپ رو کیوں رہے ہیں۔ طبیعت تو ابھی کہہ رہے تھے کہ ٹھیک ہے"۔

تکیہ کے نیچے سے انہوں نے تولیہ نکال کر آنکھیں پونچھیں۔ پھر میری طرف دیکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ دو چار لفظ بول کر پھر رک گئے۔ میرے اصرار پر فیاض صاحب نے ایک سگریٹ سلگایا اور دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا:۔

"معافی چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو اس قدر پریشان ہونا پڑ رہا ہے۔ آج پرانے

دنوں کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ مگر کیا عرض کروں۔ زبان پر تالے لگے ہیں۔ کچھ کہنے کی خواہش ہوتی ہے پر ایک دم کچھ اور خیال آجاتا ہے۔ جو اپنی ہی طرف کھینچتا ہے۔ آج میرا دل میدان جنگ سے کم نہیں۔ نہ جانے کیوں طرح طرح کے خیالات ابھرتے ہیں۔ اور پھر آپس میں ہی ٹکرا جاتے ہیں۔ کبھی ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ اور کبھی آپ ہی آپ آنکھیں تر ہو جاتی ہیں۔ اس کشمکش نے کل سے مجھے حیران کر رکھا ہے"۔

میں نے بھائی جان کی بات کاٹتے ہوئے اصرار کیا کہ انہیں سب کچھ صاف صاف بتانے میں ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے :۔ "کیا آپ مجھے اپنا سچا دوست نہیں مانتے ہیں۔ کیا میں بھی حالات سے واقف نہیں ہوں؟۔ پھر آپ کیوں اپنے دل کا بوجھ اپنے ہی تک رکھتے ہیں۔ صاف صاف کہیے۔ شاید میں آپ کا بوجھ بٹا سکوں"۔

فیاض حسین کی آنکھیں پھر بھر آئیں اور رندھے ہوئے گلے سے انہوں نے بولنا شروع کیا :۔ "آپ کی محبت اور نیک نیتی پر میں جیتے جی شک کرنا حرام سمجھوں گا۔ سچ پوچھیے تو آپ کی برادرانہ ہمدردی ہی میرے لئے ایک شعلہ بنی ہوئی ہے۔ اس وقت میرے خیالات کی روانی میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مجھے ہفتوں سے رشید اور دوسرے دوست یاد آرہے ہیں۔ کبھی سوچتا ہوں کتنا اچھا ہوتا اگر میں بھی پاکستان چلا گیا ہوتا۔ یہ سوچتے ہی جھٹکا سا لگتا ہے۔ اور دل کو ٹھیس لگتی ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کیا واقعی اب دلّی مسلمانوں کے لئے پردیس ہو چلی ہے۔ کیا ایماندار مسلمان بھی اب جامع مسجد اور لال قلعہ کے بارے میں صرف کتابوں میں ہی پڑھا کریں گے۔ اور انہیں آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں گے۔ کیا اب سرزمین ہند اسلام کے پودے کو نشو و نما دے سکے گی؟ کیا واقعی انگریزوں اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں؟ اور کیا مسلمان بھی انگریزوں کی طرح ہندوستان سے کوچ کر سکتے ہیں؟ کیا ہم لوگ یہاں صرف حکمراں ہی کی

حیثیت سے رہے؟ کیا اس سرزمین سے مسلمانوں کو کوئی لگاؤ نہیں"؟

بھائی جان یہ الفاظ بولتے بولتے بیہوش ہو کر تکیہ پر گر پڑے۔ کرسی سے اٹھ کر ایکدم میں نے ان کے سر کو سنبھالا وہ بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ میں نے کہا اب آپ خاموش ہی رہیں۔ آپ کے لئے بولنا ٹھیک نہیں۔ آپ بہت زیادہ جذباتی ہو گئے ہیں۔ اور جذبات کی رو میں بہہ رہے ہیں۔ آپ کا جسم اس قدر بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تو سمجھا تھا میرے کہنے کا بھائی جان پر اثر ہوا ہو گا۔ اسی لئے وہ اب چپ ہیں۔ مگر میں آخری جملہ ختم ہی کرنے جا رہا تھا کہ وہ ایک دم اٹھ بیٹھے اور جوش میں آکر پھر بولنے لگے :۔

"میں کیسے خاموش رہ سکتا ہوں۔ ایک طرف تو مجھے پرانے دوست یاد آتے ہیں جن کے بنا اب دلی ویران سی دکھائی دیتی ہے۔ اور دوسری طرف مجھے ان چار صدیوں کا خیال آتا ہے جو میرے بزرگوں نے اس ملک میں گذاری ہیں۔ شاید آپ کو پتہ نہیں کہ میں بارہ[لہ] کے سیّدوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں ____ اسی دلی میں اٹھارھویں صدی میں میرے باپ دادا برسوں بادشاہوں کے وزیر رہے۔ ہم لوگوں نے تب سے ہی دلی کو اپنا گھر مانا ہے۔ دلی پر کوئی احسان نہیں۔ کہیں اور ہمارا گھر بار بھی تو نہیں تھا۔ جب مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد آتا ہے تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ میں بارہ سال کا تھا جب ایکبار میرے والد سخت بیمار ہو گئے۔ میرے چچا حیدرآباد کی فوج میں بہت بڑے افسر تھے۔ انہوں نے میرے والد کو بہت بلایا۔ پر والدہ کے سمجھانے پر بھی وہ وہاں نہیں گئے۔ اور چچا کو لکھ بھیجا :۔ "گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ امید ہے

لہ تاریخ کے طلبار جانتے ہیں کہ بارہ کے سیّد اٹھارھویں صدی میں قریب، چالیس سال تک مغل بادشاہوں کے وزیر رہے۔ حکومت کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھ میں رہی۔

ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اگر خدا کو کچھ اور منظور ہے تو وہ ہی سہی۔ مرنا ہی ہے تو اس جہاں میں دلّی سے بڑھ کر کونسی جگہ اچھی ہو سکتی ہے"۔ آخر والد کا انتقال دلّی ہی میں ہوا"۔

یہ قصہ سناتے سناتے فیاض حسین کی آنکھیں پھر تر ہو گئیں۔ میں ان کی ذہنی تکلیف کی جھلک ان کے چہرہ پر دیکھ رہا تھا۔ سیاست سے انہیں زیادہ دلچسپی نہیں رہی لیکن وہ ۱۹۴۵ء ۱۹۴۶ء میں پاکستان کے حامی تھے۔ مسلم لیگ کے وہ کبھی ممبر نہیں رہے۔ لیکن ان کا یقین تھا کہ یہ تنظیم ہی مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہے۔ یہی پرانی باتیں ان کو یاد آرہی تھیں۔ اچانک انہوں نے اپنی حالت کو سنبھالا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بھائی جان نے پھر بولنا شروع کیا:-

" پاکستان کا ظہور میں آنا اچھا ہے یا برا اس پر بحث کرنا اپنے ہی بال آپ نوچنے کے برابر ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ کم سے کم اب ہندوستانی مسلمانوں کو پاکستان کے بارے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہی اپنے مسئلے کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ جب میں یہاں کے مسلمانوں کی موجودہ حالت کا خیال کرتا ہوں تو مجھے فوراً غدر کے بعد کے دنوں کی یاد آجاتی ہے۔ میں نے غدر نہیں دیکھا۔ میری تو پیدائش ۱۸۶۹ء کی ہے۔ پر ان دنوں کے حالات سے میں خوب واقف ہوں مسلمانوں کی حکومت ہی نہیں سب امیروں کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ انگریز حاکم کی نظر میں ہم سب باغی تھے۔ اور اس لئے سزا کے مستحق۔ یہ پالیسی غدر کے تیس چالیس سال بعد تک چلتی رہی۔ مسلمان گن گن کر دن کاٹ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کافی ظلم و ستم اٹھانے کے بعد امید کی کرن نظر آئی۔ میرے بزرگ دوست سر سید احمد خاں نے راستہ دکھایا۔ ان کی بتلائی راہ پر چل کر کچھ برسوں میں ہی مسلمان سنبھل گئے۔ انہوں نے نئے حالات کو سمجھنا شروع کیا۔ اور بہتوں نے اپنے کو حالات کے مطابق بھی ڈھال لیا۔ تاریکی کے بادل دھیرے دھیرے چھٹنے لگے۔ اپنا فرض مسلمان سمجھنے لگے اور ۱۹۰۰ء تک ہندوستان کے

دوسرے لوگوں کی طرح ہی مسلمان بھی اس ملک میں رہنے لگے"۔

یہاں فیاض کچھ رکے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ انیسویں صدی سے اب وہ بیسویں صدی کے حالات پر آنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ایک دم رک گئے۔ کسی بھی مبصر کے لئے زمانہ حال پر تنقید کرنا ماضی کے حالات کی تنقید سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ماضی تاریخ ہوتی ہے جبکہ حال زندگی کی الجھنیں۔ اس لئے کوئی بھی سمجھدار انسان حال کے بارے میں بات کرنے سے پہلے اپنے خیالات کو تولے گا اور حتی الامکان غیر جانب داری سے غور و فکر کرنے کی کوشش کرے گا۔

میں نے سمجھا بھائی جان اسی لئے خاموش ہو گئے۔ وہ بھی اپنے خیالات کو تول رہے ہوں گے۔ مگر میرا تجسس اس قدر بڑھ گیا تھا کہ میں حال کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے کہا:۔ "غدر کے بعد کے زمانے سے حال کا موازنہ کرنا مجھے بھی مناسب لگتا ہے۔ یہ موازنہ تو ٹھیک ہے مگر انہیں ایک جیسا سمجھنا غلط ہے۔ اُن دنوں مسلمانوں پر جو ابتلا آئی تھی وہ واقعی بھیانک تھی۔ ہو سکتا ہے اردو شاعروں و ادیبوں کی رائے میں وہ قیامت کے برابر ہو۔ آج جو حالات ہیں ان کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ بات سبھی تسلیم کریں گے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے جو حالات ملک کی تقسیم نے پیدا کر دیئے ہیں وہ بھی بہت پیچیدہ ہیں۔ لیکن بھائی جان یہ مت بھولئے غدر کے بعد حاکموں اور آج کے حاکموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سچ پوچھئے تو اس ملک میں آج حاکم ہے ہی نہیں۔ عوام ہی سب کچھ ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں عوام میں کروڑوں مسلمان بھی ہیں۔ پھر بھی میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا کہ موجودہ حالات بہت سے مسلمانوں کے لئے مصیبت کا پیش خیمہ ہو سکتے ہیں۔۔۔"

بھائی جان جواب شاید اپنی ذہنی الجھنوں پر قابو پا چکے تھے میری بات کاٹ کر بولے:۔

"آپ بھی نجومی جان پڑتے ہیں خوب آپ نے میرے دل کی بات کہی ہے۔ واقعی میں آج کے

واقعات کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ یہ تو آپ مانئے ہی گا کہ پاکستان بنتے ہی ہندوستان کے مسلمان خوف کھا گئے۔ میں کسی کو قصور وار نہیں ٹھہراتا۔ اور نہ اس بات ہی سے منہ موڑوں گا کہ ہمارے سچے خیر خواہ بھی اس ملک میں ہیں۔ اگر مسلمانوں پر مصیبت آئی تو یہ بھی ٹھیک ہے کہ جان اور عزت کو خطرے میں ڈال کر یہاں کے رہنماؤں نے ہی ان کی حفاظت کی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کے لئے ہی گاندھی جی نے جان دی۔ ان کی انتہائی قربانی سے مسلمان بہت متاثر ہوئے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہندوستان کے لیڈر ہندو مسلمان میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔ اور سب کو برابر حقوق دینا چاہتے ہیں۔ مجھے کل ہی زاہد نے بتلایا کہ برابری کی بات اب ہندوستان کے آئین میں بھی شامل کر دی گئی ہے۔ اس لئے یہ صحیح ہے کہ لیڈران جو کہہ رہے ہیں۔ اس میں سے بہت کچھ انہوں نے عملی طور پر کر بھی ڈالا ہے۔ مگر... مگر کیا اجازت ہے کہ تصویر کے دوسرے رخ کو بھی اجاگر کر دوں؟"

"ضرور" میں نے کہا:۔" بولئے نا ہچکچاہٹ کس بات کی ہے۔ اگر دو دوست بھی اس معاملہ پر صاف صاف بات نہیں کر سکتے تو وہ تو اور بھی برا ہوگا۔ میں بے شک ہندو ہوں مگر ہندوستانی بھی..."

بھائی جان چپ نہ رہ سکے:۔" ارے بھئی تم کہاں سے کہاں پہونچ گئے۔ قسم ہے میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو ویسے ہی بولتا بولتا رک گیا تھا۔ لو اب سنو۔ سچی بات کہنے میں جھجک کیسی۔ بات یہ ہے کہ حکومت کی پوری کوشش کے باوجود بھی کچھ مشکلات کا مسلمانوں کو سامنا ہے۔ وجہ کچھ ہی ہو۔ مشکل کو تو مشکل ہی کہا جائے گا۔ آپ کو شاید معلوم ہی ہے کہ ہندوستان کا شاید ہی ایسا کوئی بڑا مسلم گھرانہ ہوگا۔ جس میں سے دو چار افراد پاکستان نہ چلے گئے ہوں۔ دلّی کا تو ذکر ہی نہ کیجئے۔ یہاں تو ایک بھی گھر ایسا نہیں۔ جس میں سے آدھے آدمی پاکستان نہ چلے گئے ہوں

نوکری پیشہ لوگ تو سبھی چلے گئے۔ اس لئے ہم سب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کی بات سنتے ہیں تو سب کا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہم تو یہاں ہیں اور بہت سے عزیز پاکستان میں۔ ہمیں یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں کس نے کیا کہا! کیا کیا ___؟ پاکستان نے زیادتی کی یا ہندوستان نے ___؟ ایمان دار آدمی یہ بھی مانے گا کہ ہماری سرکار نے پاکستان سے سچی دوستی نبھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ خدا جانے تہہ میں کیا بات ہے؟ اب منی آڈر آنے جانے بند ہو گئے ہیں۔ بھلا کل اگر خط پتر بھی آنے بند ہو جائیں تو ہمارا حال کیا ہوگا۔ میرے ہی سات عزیز پاکستان میں ہیں۔ ان کی خیر خبر اگر دو ہفتہ نہ آئے تو بے چین ہو جاتا ہوں"۔

جس ہمت اور غیر جانبداری سے بھائی جان نے مسلمانوں کی مشکلات کا بیان کیا وہ سچ مچ غیر معمولی بات تھی۔ ان کی بات بالکل سچ ہے۔ پھر بھی میں نے سوچا اس معاملہ میں انہیں اور کچھ بتاؤں۔ اس لئے میں نے پیالوں میں چائے ڈالتے ہوئے کہا:۔ "آپ کی بات میں بالکل سمجھ گیا۔ میں صفائی پیش نہیں کروں گا۔ لیکن اس بارے میں میری جو رائے ہے۔ آپ کے سامنے رکھوں گا۔ اس تقسیم سے دونوں طرف جو تباہی ہوئی۔ اس سے انکار کون کر سکتا ہے لیکن تقسیم کی مانگ پر تو مسلم لیگ ہی اڑی ہوئی تھی۔ آزادی کی خاطر ہمارے نیتاؤں نے وہ شرط بھی مان لی۔ اب آپ ہی بتلائیں پاکستان بن جانے پر ان لوگوں کو آپ کے سکھ و آرام کی کوئی فکر ہی نہیں ہونی چاہئے یہاں کے مسلمانوں میں کون پاکستان کا حامی تھا کون مخالف یہ سوال تو اب کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ پچھلی بھول چوک بٹے کھاتے میں گئی۔ اس کا حساب اب کوئی نہیں مانگتا۔ آپ لوگوں کو بلاشبہ کچھ تکلیفیں ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی تہہ تک پہونچنے پر آپ دیکھیں گے کہ ان کی ذمہ داری ہماری سرکار پر نہیں آتی بر کار تو بیچاری پاکستان کو رعایت پر رعایت دینے پر چاروں طرف بدنام ہو گئی۔ خیر اصل میں سوال

یہ ہے کہ سرکار کا مسلمانوں کی طرف کیا رخ ہے۔ اس کا جو جواب ہوگا اس سے تو ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل پر روشنی پڑے گی"۔

بھائی جان کے چہرے پر کچھ رونق دکھائی دی۔ اور لحاف کو اچھی طرح لپیٹتے ہوئے وہ بولے :۔ "واہ! واہ! کیا خوب آپ نے میرے دل کی بات لفظوں میں ادا کردی ہے۔ آپ لوگ چاہے کچھ ہی سمجھیں ہمارا جو آج پاکستان کے بارے میں خیال ہے۔ وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ سرکار کے ارادوں کی بات آپ نے خوب کہی۔ اگر کہیں ہند سرکار اس قدر غیر فرقہ وارانہ نہ ہوتی اور مسلمانوں کو اس کے وعدوں پر پورا یقین نہ ہوتا۔ تو واقعی یا تو سبھی مسلمان پاکستان چلے جاتے یا پنجرے میں بند طوطے کی طرح کسی نہ کسی طرح دن گذارتے۔ اب ساری بات پر غور کرنے سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جلدی ہی ہندوستان کا مسلمان اپنا سر اونچا کرے گا۔ اور ہند کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوگا۔ سر سید احمد خاں کے دیئے ہوئے سبق سے ہم آج بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان دنوں ان کے بتائے راستہ پر چلنا مشکل تھا۔ آج آسان ہی نہیں کچھ قدرتی بھی جان پڑتا ہے۔ سر سید نے ہمیں زمانہ کے ساتھ بدلنے کی نصیحت کی تھی۔ ان دنوں ہمیں انگریزوں کی ریس کرنی تھی۔ انہیں خوش کرنا تھا۔ اور انگریزی تہذیب کو اپنانا تھا۔ اور انگریز تھے ہمارے حاکم اور ہم ان کے غلام۔ بھلا ان باتوں کا آج کے حالات سے کیا مقابلہ۔ اب ہمیں ہندوستان ہی کی ایک زبان سیکھنی ہے۔ جب ہم نے انگریزی تک کو اپنایا۔ ہندی ہمارے گلے میں کیوں اٹکنے لگی یہ تو ہمارے اور بھی نزدیک ہے۔ دسیوں مسلمانوں نے اس کی جڑیں اپنے خون سے سینچی ہیں۔ جس سانچے میں یہ ڈھلی ہے۔ اس سے ہم واقف ہی نہیں۔ بلکہ اس پر اپنے بے شمار بزرگوں۔ صوفیوں اور بادشاہوں کی کوششوں کے اثرات آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور اب حاکم غلام کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ سبھی ایک جیسے ہیں۔ مکمل جمہوریت میں جو حقوق اوروں کو حاصل ہیں۔ وہی مسلمانوں کو بھی ہیں۔ انگریز

جو غیر ملکی تھے اور سدا ہم پر حکومت کرتے رہے۔ ان سے تو ہم مل کر کام کرنے کو تیار ہو گئے۔ کیا اب ہندوؤں سے ہی منہ موڑیں گے۔ ان ہندوؤں سے جن کے ساتھ ہم نے اسی ملک میں زمانہ کے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ میاں، ہیمنت۔ زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان وہ ہے جو زمانہ کی رنگینیوں سے چکاچوند ہو کر لڑکھڑانے کی بجائے ان رنگینیوں سے ہو سکے تو لطف اٹھائے۔ ورنہ کم سے کم خود کو ان کے موافق تو کر ہی لے۔ صرف وقت کا سوال ہے ابھی تک مسلمانوں نے اس معاملہ کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ میں اسے اب سمجھ پایا ہوں۔ وہ دن دور نہیں جب اسے سبھی خوب سمجھنے لگیں گے"۔

مجھے سید فیاض حسین کی باتوں میں بڑا مزا آیا۔ میں جانتا تھا وہ دل کی بات کر رہے ہیں۔ کیونکہ بناوٹ ان کے مزاج میں نہیں ہے۔ میں ان سے اتفاق کرتا ہوں کہ وہ دن دور نہیں جب سبھی مسلمان فیاض صاحب کی طرح اصلیت کو سمجھ جائیں گے۔ اور عارضی تکلیفوں کے باوجود بھی دلّی کو اپنے دل سے دور نہیں کریں گے۔

اب رات کے نو بج چکے تھے۔ میں نے بھائی صاحب سے اجازت مانگی اور بائیسکل پر چڑھ اپنے گھر کی راہ لی۔

(۲۵)

دلّی مت آنا

چندر سین میرے ماموں کے لڑکے ہوتے ہیں۔ عمر میں مجھ سے پانچ سال بڑے ہیں وہ مین پوری میں کلکٹر کے دفتر میں نوکر تھے۔ اب بھی وہیں ہیں۔ کل ملاکر دو سو کے قریب تنخواہ پاتے ہیں۔ وہ سدا اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ کبھی کسی کی بات میں دخل نہیں دیتے۔ ان کی دنیا اپنا گھر اور دفتر ہی ہے۔ مزاج سے خاموش طبع انسان ہیں۔ اور ہمیشہ اپنے ہی خیالوں میں مست رہتے ہیں۔

دو سال ہوئے میرا کسی کام سے مین پوری جانا ہوا۔ چندر سین ہی کے یہاں ٹھہرا۔ باتوں باتوں میں بھابی اور چندر سین نے دلّی آنے کی زبردست خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا چلئے آج ہی میرے ساتھ چلئے۔ اس پر انہوں نے اپنے دل کا ارادہ صاف مجھ پر ظاہر کر دیا۔ ان کا ارادہ تھا دلّی میں نوکری کرنے کا۔ اس پر میں کچھ ہنسا۔ میری ہنسی کا کچھ برا مان سنجیدہ ہو کر وہ بولے :۔

”تم نے تو ہماری بات کا مذاق ہی اڑا دیا ہے۔ جیسے میں قارون کے خزانہ کی مانگ کر بیٹھا ہوں۔

میرے ہی جیسے بہت سے نوکر لڑائی کے زمانہ میں دلّی چلے گئے تھے سبھی کی کایا پلٹ گئی۔ شو پرشاد خزانچی سے سپرانٹنڈنٹ بن گئے۔ رادھے لال جو یہاں سٹر کبین ناپا کرتے تھے۔ دلّی میں ایس ڈی او ہیں۔ کہر سنگھ کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ اسے تو تم بھی جانتے ہو۔ کہاں تو وہ سالوں کلرک رہا کہاں اب وہ اسسٹنٹ سکریٹری ہے۔ ہمیں نے کون سے پاپ کئے ہیں۔ جو کنویں کے مینڈک کی طرح مین پوری سے چپٹے رہیں۔ اگر تم چاہو اور تھوڑی سی کوشش کرو تو مرکزی حکومت کے کسی دفتر میں میری بھی بدلی ہو سکتی ہے"۔

اب میں بھائی کی بات سمجھا۔ میں نے کہا دلّی میں تبادلہ کرانا تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ دلّی جانا آپ کے لئے مفید بھی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کس قدر۔

میں نے بھابی اور بھائی دونوں کو یقین دلایا کہ اس معاملہ میں جو کچھ ہو سکے گا کروں گا اس کے بعد ہم اور باتیں کرنے لگے۔ اس بات کو تین ماہ بیت گئے۔ مجھے چندر سین کی فرمائش کا دھیان بھی نہ رہا۔ اس پر غور تو کیا کرنا تھا۔ اچانک ایک دن ان کا خط پا کر ساری بات یاد آ گئی۔ خط میں لکھا تھا :-

"مین پوری سے ہم بہت اُکتا گئے ہیں۔ یہ چھوٹی سی جگہ ہے۔ آگے بڑھنے کا یہاں کوئی راستہ نہیں ہے۔ سبھی طرح کے ذرائع محدود ہیں۔ یہاں پر رہنا پڑا تو تین سو روپیہ پر ہی ریٹائرڈ ہونا پڑے گا۔ دلّی بڑی جگہ ہے۔ بے شمار وسائل وہاں موجود ہیں۔ آدمی میں ہمت چاہئے۔ دلّی میں رہتے اُسے آگے بڑھنے میں دیر نہیں لگے گی۔ تھوڑی سی کوشش سے ہی یہاں آدمی ترقی کر سکتا ہے۔ اور اپنے مستقبل کو روشن بنا سکتا ہے"۔

اپنی فطری سستی پر قابو پا کاغذ قلم لے میں فوراً اس خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ جو خط میں نے لکھا وہ اس طرح تھا :-

" بھائی چندرسین جی!

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مہینوں سے میں آپ کو نہیں لکھ سکا۔ ترقی کرنے کی آپ کی خواہش کو میں تسلیم کرتا ہوں۔ اور اس سلسلہ میں اگر میں کچھ کر سکوں تو میرے لئے خوش قسمتی کی بات ہوگی مگر اس بارے میں میرے جو خیالات ہیں۔ ان کو صاف صاف آپ کے سامنے نہ رکھنا عظیم گناہ ہوگا۔ مین پوری اور دلّی کے بارے میں آپ کے خیالات غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ بے شک دلّی مین پوری سے بہت بڑی ہے۔ مگر وہ اسی وجہ سے مین پوری سے اچھی جگہ نہیں ہے میری رائے ہے کہ جگہ جس قدر چھوٹی ہوگی اتنی ہی اچھی ہوگی۔ اور دلّی کا حال تو آج کل بہت ہی خراب ہے۔ یہاں اسی کو رہنا چاہیئے جس کے لئے دنیا میں کہیں اور ٹھکانا نہ ہو۔ یہاں کی ترقی مشکل سے دس میں سے ایک کو راس آتی ہے۔ باقی نو کے لئے یہ قطعی دھوکا ہے۔ آپ تبیل دار ہیں اگر بھولے سے بھی کوئی غلطی ہوگئی تو برا ہوگا۔

" میں سوچتا ہوں رہنے کے لئے مین پوری دلّی سے کہیں اچھی جگہ ہے۔ آپ کی تنخواہ دو سو روپے ہے۔ آپ کے اخراجات بھی بہت ہیں۔ اس لئے آپ بچا بھی کچھ نہیں پاتے ہیں۔ اور پوری تنخواہ ہر ماہ خرچ ہو جاتی ہے۔ دلّی کا کوئی باشندہ آپ کو خوش قسمت مانے گا۔ مان لیجئے دلّی میں آپ کو تین سو روپے ماہانہ ملیں۔ یہاں آپ کا خرچ تین سو، پچاس سے کم نہیں ہوگا۔ اس معاملہ میں مجھ سے بحث نہ کیجئے۔ یہاں بڑے بڑے بحث کرنے والوں کی ہنسی اڑ چکی ہے۔ یہاں کا ماحول۔ رہن سہن۔ معیار زندگی۔ سماجی زندگی سبھی کچھ نرالے ہیں۔ یہاں جتنا کوئی کماتا ہے اگر اتنے ہی میں گذر کرے (اگر یہ ممکن ہو)، تو زندگی بے کیف بن جاتی ہے۔ آدمی جینے سے اکتا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں کمائی سے زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔

" علم معاشیات کے بنیادی اصول یہاں بدلے ہوئے سے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں

کی زندگی میں بے شمار مشکلات ہیں۔ ان پر جب دلّی میں رہنے والے سنجیدگی سے غور و فکر کرتے ہیں وہ یا تو یہاں۔ سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ یا تماشائی بن جاتے ہیں۔ اس لئے میری آپ سے باادب درخواست ہے کہ دلّی کی مشکلات آپ کو بھلے ہی عقلمند دنیادار بنا دیں۔ مگر آپ کی گرہستی کو بلاشبہ چوپٹ کر دیں گی۔"

چندرسین بھلا کہاں ماننے والے تھے۔ میں ان کو الزام بھی نہیں دیتا۔ کیونکہ گونگے کے گڑ کی طرح دلّی کو سمجھنے کے لئے یہاں رہنا ضروری ہے۔ انہیں میری بات پر یقین نہیں ہوا۔ میرے خط پر ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:۔

پیارے ہیمنت!

آپ نے تمام باتیں بڑھا چڑھا کر لکھی ہیں یا صرف مجھ سے مذاق کیا ہے۔ جب آپ خود دلّی میں آرام کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اور پھل پھول رہے ہیں۔ پھر اوروں کو ہی دلّی کیوں کاٹ کھائے گی۔ ممکن ہے آپ اس لئے گھبرا گئے ہوں کہ دلّی میں آکر میں آپ کے اوپر بوجھ بن جاؤں گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ راجدھانی میں پہونچ کر ایک دن کے لئے بھی آپ کو تکلیف نہیں دوں گا۔ ہوسکتا ہے آپ مجھے کنوئیں کا مینڈک ہی سمجھتے ہوں جسے مین پوری جیسے شہر میں ہی رہنا چاہیئے۔ پر آپ کیا مجھے نوکری پر ترقی کا حق بھی نہیں دینا چاہتے۔ آخر اتنی دنیا دلّی میں رہ رہی ہے۔ پھر میرے ہی لئے یہ کانٹا کیوں بن جائے گی"۔

دلیل کو میں نے زندگی میں کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ اس سے زیادہ میں حالات کا قائل ہوں۔ میں نے چندرسین جی کو لکھ بھیجا اب میں ان سے بحث نہیں کروں گا۔ دلّی آزاد ہندوستان کی راجدھانی ہے۔ اس کو جاننے اور اس میں رہنے کا سبھی کو حق ہے۔

تین چار ماہ بعد ہی چندرسین دلّی آگئے۔ تکلیف نہ دینے کی قسم تو وہ کھا ہی چکے تھے۔

اسٹیشن سے اترتے ہی فتحپوری کے کسی ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ اب وہ مرکزی سرکار کی ایک وزارت میں اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ یہاں آنے سے انہیں کل ملا کر ستر روپیہ ماہوار کا فائدہ ہوا۔ کچھ دنوں تک تو بہت خوش رہے۔ مگر پندرہ روز میں ہی ہوٹل کی زندگی سے اکتا گئے۔ اب مکان کی تلاش شروع ہو گئی۔ مجھے بھی انہوں نے تاکید کی۔ میں نے ان کو بڑی نرمی سے سمجھایا تلاش تو اس چیز کی کی جاتی ہے جو موجود ہو پر کسی وجہ سے نظر نہ آتی ہو۔ دلّی میں مکان کی تلاش سراسر بیکار ہے۔ جو چیز یہاں ہے ہی نہیں۔ اس کی تلاش کیسی؟ میں نے کہا دیکھئے مکان کی تلاش کا ارادہ چھوڑ دیجئے۔ آپ کے دفتر میں جتنے کلرک ہوں ان سے بات چیت کیجئے۔ کوئی تو ایسا ہو گا ہی جو آپ کو خوش کرنا چاہے گا۔ بس وہی آدمی آپ کے مرض کی دوا کر سکتا ہے۔ اپنے سرکاری مکان میں ہی کوئی حصہ دار بنائے تو بنائے۔ ورنہ مکان کا یہاں کیا کام؟

چندر سین کو میری بات پسند آئی۔ انہوں نے اپنے دفتر میں بات چیت کرنی شروع کی۔ کچھ دنوں بعد انہیں لودی کالونی میں ایک کمرہ اور ایک برآمدہ مل گیا۔ کرایہ چالیس روپیہ ماہوار ٹھہرا۔ بین پوری میں وہ ۷ روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ فوراً اپنے خاندان کو لے آئے۔ ان کے تین بچے اسکول میں پڑھتے تھے۔ دو لڑکے ایک لڑکی۔ اب ان کو مقامی اسکولوں میں داخل کرانے کا مسئلہ آیا۔ میں یہاں بھی ان کی مدد نہ کر سکا۔ خالی مشورہ ہی دے پایا۔ میں نے مشورہ دیا اسکول کے چکر کو چھوڑ۔ بچوں کی پڑھائی کے کام پر بھی کسی کلرک کو ہی لگایا جائے۔ چندر سین نے میرے مشورہ کو پھر ٹھکرایا۔ پر پہلے کی طرح انہیں ہار ماننی پڑی۔ ۳۰ روپیہ ماہوار پر۔ بچوں کو گھر پر پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر رکھنا پڑا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ اپریل میں بچوں کو اسکول میں داخل کرا دیا جائے گا۔ تب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

اپریل آتے بھی دیر نہ لگی۔ اگرچہ بچوں کے نام پہلے ہی سے درج کرائے ہوئے تھے۔ پھر

بھی وہ بڑی دردسری کے بعد داخل کرائے جاسکے۔ دوسرے ہی دن یہ سوال اٹھا چار میل دور یہ بچّے جائیں گے کیسے۔ ہار جھک مار بس کا انتظام کرنا پڑا۔ جس کا خرچ تین بچوں کے لئے تیس روپیہ ماہوار تھا۔ اب دھیرے دھیرے چندرسین کو دلّی کی زندگی کا اصل روپ نظر آنے لگا۔ انہیں جو بھی تنخواہ ملتی تھی اس کا تین چوتھائی بچوں کی فیس، مکان کا کرایہ، بجلی پانی کا بل دودھ والے کا بل (جو مین پوری سے بلاشبہ دوگنا ہوتا تھا) وغیرہ ادا کرنے میں خرچ ہوجاتا تھا۔ باقی تنخواہ ہزار کوشش کرنے پر بھی بیس تاریخ سے آگے نہیں چلتی تھی۔ اس کے بعد سارا کام ادھار پر چلنے لگا۔

چندرسین کو اکثر میں متفکر دیکھتا۔ وہ ہمیشہ معاشی فکروں میں ہی گھرے رہتے تھے۔ ایکدن جب میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ان کے گھر گیا ہوا تھا۔ ان کا کوئی جاننے والا شخص ان سے ملنے آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی آنے والے نے چندرسین سے اصرار کیا کہ وہ پانچ ہزار کا بیمہ کرالے۔ یہ سنتے ہی چندرسین آگ بگولہ ہوگئے۔ بہت جھلّا کر بولے :۔

"نہیں صاحب بہت غلط بات ہے بیمہ کے بارے میں مَیں بات کرنے کو تیار نہیں۔ بدقسمتی سے جو ۱۲ ہزار کا بیمہ پہلے سے کیا ہوا ہے اس کا چندہ سال بھر سے نہیں دے پایا ہوں۔ نئی بلا مول لینا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ لوگ بیمہ کا کام کہیں اور کیجئے۔ دلّی میں یہ کام کرنا کسی کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ اوروں کے بارے میں تو زیادہ نہیں جانتا۔ پر میرا ایسا برا حال کبھی نہیں ہوا۔ دن رات میں پیسے کے سوائے کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ سدا پیسے کی ادھیڑ بن میں ہی پھنسا رہتا ہوں۔ پھر ہر ماہ روتے پیٹتے ہی کٹتا ہے۔ ایسی ذہنی حالت میں اگر میں کہیں دوسرا بیمہ کرا بیٹھا تو سچ جانئے مرنا جینے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور اچھا معلوم ہونے لگے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں خودکشی نہ کر بیٹھوں۔"

آنے والا بیچارہ کچھ کہے بغیر چپ چاپ اٹھکر چلا گیا چندر سین کی بات سن کر میں دل ہی دل میں بہت رنجیدہ ہوا۔ کچھ خوش بھی ہوا۔ میری بات نہ مان کر فضول ہی انہوں نے اپنے لئے آگ پر چلنے کی آزمائش اور اپنے بچوں کے لئے بیشمار تکلیفوں کو دعوت دی۔ مگر میں خاموش رہا۔ دل میں سوچا اس موضوع پر اس وقت بات کروں گا جب چندر سین خود ہی بولیں گے۔

وہ دن بھی آپہونچا جب چندر سین کا بوجھ اسقدر بڑھ گیا کہ اسے اٹھانے کے لئے انہوں نے اپنے کو ناقابل پایا۔ ایک دن وہ شام کو مجھے دفتر میں ملے ان کی آنکھوں اور ہیئت سے صاف پتہ لگ رہا تھا کہ ان کا دل بھرا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ان کی پیشانی کی لکیریں اس بات کا اعلان کر رہی تھیں کہ بہت غور و فکر کے بعد انھوں نے کوئی دریافت کر ڈالی ہے۔ ان کی خاموشی اور سنجیدگی میں کسی فلسفی کی خصوصیات کی جھلک پائی جا رہی تھیں۔ جھجک کو بالائے طاق رکھ رندھے گلے سے اس طرح گویا ہوئے:۔ "بس بہت ہو چکا۔ زیادہ ثبوت کی ضرورت نہیں۔ تم نے دلّی کے بارے میں ڈیڑھ سال ہوئے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بہ حرف سچ نکلا۔ آج مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ دلّی آکر میں نے بھاری بھول کی۔ جو پندرہ سو روپیہ میں سال میں بچایا تھا۔ وہ سب خرچ ہو گیا۔ دو ہزار کا قرض اور سر پر اٹھالیا۔ بچوں کا ایک ایک سال مارا گیا۔ اور ان کی تعلیم چوپٹ ہو گئی۔ ان اٹھارہ ماہ میں جو بھیانک تکلیفیں ہم نے اٹھائی ہیں۔ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ آج صبح میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے جلدی دلّی چھوڑنا ہوگا ابھی ابھی کلکٹر کے نام خط ڈالکر آیا ہوں۔ کہ مجھے پھر سے مین پوری بلالیا جائے۔ اس وقت یہاں میری تنخواہ ۲۰۶ روپیہ ماہوار ہے۔ مین پوری میں دو سو دس ہوگی۔ ساتھ ہی میں یہ بھی بتا دوں کہ چھ مہینہ سے میں اسی روپیہ ماہوار پہ مقامی سنیما اسٹور میں ایک گھنٹہ روز کام کر رہا ہوں۔ مگر نہ جانے یہ سب روپیہ کہاں چلا جاتا ہے۔ دلّی کا پیٹ بہت بڑا ہے میں اسے کبھی نہیں بھر پاؤں گا۔ مین پوری کے دو سو دس روپیہ میں ہی مجھے سکھ مل سکتا ہے۔"

اس کھوج (دریافت) کے لئے میں نے چندرسین کو مبارکباد دی - اور بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے ان کا اشیرواد چاہا کہ جس آسانی سے وہ دلّی کے پنجے سے نکل گئے ہیں خدا مجھے بھی نکالدے -

(۲۶)

دلّی کا بدلتا ہوا جغرافیہ

آج سے دس سال پہلے اگر کوئی دلّی کی حدود کے بارے میں پوچھتا تو ہم کہہ سکتے تھے:۔
"دلّی وہ شہر ہے جس کے شمال میں تیمار پور۔ جنوب میں صفدر جنگ، مغرب میں شادی پورہ اور مشرق میں شاہدرہ ہیں"۔ اگر یہی بات آج ۱۹۵۰ء ۱۹۵۱ء میں کسی کو بتلائی جائے تو وہ ہنسے گا۔ تیمار پور۔ صفدر جنگ۔ شادی پور اور شاہدرہ اب دلّی کے ہی حصے بن گئے ہیں۔ دلّی کی موجودہ جغرافیائی حالت اب ان مقامات کی مدد سے بیان نہیں کی جا سکتی ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ دلّی وہ شہر ہے جس کے شمال جنوب۔ مشرق اور مغرب سبھی سمتوں میں دلّی ہی دلّی ہے۔

تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ نئی دلّی جہاں جمہوریہ ہند کے مرکزی دفاتر واقع ہیں یہ آٹھویں دلّی ہے۔ جسے آج پرانی دلّی کہا جاتا ہے وہ ساتویں ہے۔ ان سے پہلے مسلم دور حکومت میں چار دلّیاں بسیں اور اجڑیں۔ آج دلّی کا پھیلاؤ ہماری سیاسی اور تہذیبی وسعت کے مطابق ہی پھیل رہا ہے۔ کیونکہ پچھلی دس صدیوں میں ادھر اُدھر جتنی دلّیاں بس کر اجڑیں تھیں ان میں پھر سے زندگی کے آثار

دکھائی دینے لگے ہیں۔ دور وسطی کے انقلابات نے سرزمین دلّی پر جو زخم لگائے تھے وہ آج آزاد ہندوستان نے اپنی وسعتوں سے بھر دیئے ہیں۔ اب اجڑی اور پس ماندہ دلّیاں پھر سے شہر بنتے جا رہی ہیں۔

یہ حادثہ تو بڑا خوبصورت ہے۔ مگر تعمیر نو کی مسرتوں میں بھی درد کا پہلو چھپا ہے۔ قدرت نے دلّی پر بے پناہ مہربانی کی ہے۔ میدانی علاقہ ہوتے ہوئے بھی دلّی میں پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ جس نے دلّی کی قدرتی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ انگریزی دور میں ان پہاڑیوں کو "رِج" کا خطاب ملا تھا۔ جو آج بھی مروج ہے۔ پہاڑیوں کے اس سلسلہ نے دلّی کو فطری حسن ہی نہیں دیا بلکہ قیمتی پتھر۔ جنگل۔ بہت سی سبزیاں اور بہت سے جنگلی جانور بھی دیئے ہیں جیسے جیسے دلّیوں کے دوبارہ ملنے کا عمل دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہے ویسے ویسے یہ سب قدرتی تحفے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ مستقبل میں ایک وقت آئے گا جب دلّی کا یہ پہاڑی سلسلہ بالکل ختم ہو جائے گا۔

دوسرے شہروں میں سڑکیں اور مکانات بنوانے کے لئے پتھر دوسرے شہروں سے منگوانا پڑتا ہے۔ دلّی کے انجینئر اس جھگڑے سے آزاد ہیں۔ دلّی کی پہاڑیوں میں اسقدر پتھر ہیں کہ آپ جتنی سڑکیں چاہیں بنا سکتے ہیں۔ اور موجودہ سڑکوں کو جسقدر چاہیں وسیع کر سکتے ہیں۔ اس پتھر سے جہاں تعمیری کاموں میں مدد ملی ہے وہاں ان پہاڑیوں سے سخت تکلیف بھی پہونچی ہے۔ کئی مقامات سے پہاڑیاں بالکل غائب ہو گئی ہیں۔ اگرچہ ان کی شکلیں اور پتھر اب بھی کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ لیکن ان پہاڑیوں کے دونوں طرف جو جنگل تھے وہ بالکل ختم ہو گئے ہیں۔

۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ میں اپنے دوست شری کول کے ساتھ پوسا انسٹیٹیوٹ گیا ہوا تھا۔ شری کول وہاں انجینئر ہیں۔ ان کے یہاں کھانا کھاتے بہت دیر ہو گئی۔ سردیوں کے دن تھے دس بجے میں نے اپنی سائیکل اٹھائی۔ اور چل پڑا۔ کچھ دور پوسا روڈ تک میرے ساتھ شری کول بھی آئے۔ ان دنوں پوسا روڈ کے دونوں طرف بالکل جنگل بیابان تھا۔ پوسا روڈ اور نئی دلّی

کے بیچ بھی گھنا جنگل تھا۔ اور ایک نالا تھا جو پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ تغلق آباد تک جاتا تھا۔ اسے خونی نالہ کہتے ہیں۔ جیسے ہی ہم پوسا روڈ پر آئے۔ ہم نے دیکھا کہ نالے کی طرف سے دو آدمی بھاگے ہوئے آرہے ہیں، ہمیں دیکھ کر وہ رک گئے۔ کول صاحب نے پوچھا کیا بات ہے۔ ان میں سے ایک بولا "صاحب نالے کی دوسری طرف جانور ہے۔ ہماری ایک بکری کو اس نے مار ڈالا ہے۔ اور اسے کھا رہا ہے۔ ہم سڑک پر چونگی کے پاس پڑے سو رہے تھے۔ جانور کی آواز سے ہی ہماری آنکھ کھل گئی۔"

کول صاحب کو اور کیا چاہئے تھا۔ مجھے ان آدمیوں کے ساتھ کھڑا کر خود سائیکل پر سوار ہو کر گھر سے بندوق لینے چلے گئے۔ دس منٹ میں ہی وہ بندوق سمیت لوٹ آئے۔ سائیکل تو ہم نے سڑک کے ایک طرف رکھ دی۔ اور چاروں آدمی خونی نالے کی طرف چل دیئے۔ نالے کے پاس پہونچتے ہی ہمیں بجلی کی طرح چمکتی دو آنکھیں دکھائی دیں۔ جانور نالہ کی دوسری طرف تھا اور ہم اس طرف۔ اس لئے ہمیں من مانی کرنے میں زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ ہم سب کو وہیں کھڑا کر شری کول آگے بڑھے۔ نالہ کے اندر اتر کر انہوں نے گولی چلا دی۔ جانور نے ایکدم چنگھاڑنا شروع کیا۔ اس کے بعد فوراً ہی تین چار گولیاں اور چلیں۔ پھر ہم سب کو شری کول نے بلا لیا۔ نالے سے نکلکر ہم چاروں مردہ جانور کے پاس گئے۔ یہ پانچ فٹ لمبا چیتا تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے دلی کی میونسپل حدود میں مارا جانے والا یہ آخری خونخوار جانور تھا۔ گیدڑ تو اب بھی شام کو بولتے سنائی دیتے ہیں۔ مگر چیتے کے آنے کا اب یہاں کوئی امکان نہیں۔ خونی نالے کا ایک حصہ بند کر دیا گیا ہے۔ اور جہاں اونچی نیچی پہاڑیوں میں ۱۹۴۲ء میں ہمارے دوست نے چیتے کا شکار کیا تھا وہاں آج شرنارتھیوں کی ایک بستی بس گئی ہے جس کی آبادی بیس ہزار سے اوپر ہے۔ لگ بھگ یہی حال صفدر جنگ کے سامنے بھوگل کے قریب جو بنجر میدان پڑا تھا اس کا ہوا ہے۔ زمین کے چاروں طرف جھاڑ جھنکاڑ پیل کے درخت اور ٹینٹ کی جھاڑیاں تھیں۔

صفدر جنگ سے نظام الدین تک یہ سارا علاقہ ویران پڑا تھا۔ کہیں کہیں کوئی پرانی قبر دکھائی دیتی تھی۔ نہیں تو چاروں طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ آج وہاں نئی دلی کی سب سے خوبصورت بستی ہے جس میں تقریباً ۵۰۰ ۴ خوبصورت مکانات اور سو دکانیں ہیں۔ اس بستی کی آبادی پچیس ہزار سے اوپر ہے۔ اس کا نام لودھی کالونی ہے۔ کیلاش جی اسے ہندوستان کی سب سے بڑی چھاؤنی کہا کرتے تھے۔

چاندنی چوک کے سرے پر دیوان ہال کے سامنے چار سال پہلے ایک بڑا خوبصورت باغ تھا۔ اس کی ہری بھری گھاس پر شام کے وقت لالہ لوگ دکانوں سے فارغ ہوکر گھاس پر لیٹ کر یا دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر تفریح کیا کرتے تھے۔ دن کے وقت یہاں بچے پتنگ اڑایا کرتے تھے۔ یہ باغ جمنا کے راستہ میں تھا۔ جمنا سے آتی جاتی خواتین یہاں پانچ منٹ بیٹھ کر سانس لیا کرتی تھیں۔ جمنا میں غسل کے بعد جو بچّے یا لڑکیاں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جاتے تھے وہ سب اس باغ میں اکٹھے ہوکر اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ آج اس باغ کو ایک وسیع بازار میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جس میں ولائتی کپڑے سے لیکر پرانے گلدستے اور پرچ پیالے تک ملتے ہیں۔ اس بازار میں سو سے اوپر دکانیں ہیں ایک وقت تو ایسا تھا کہ اس بازار کی وجہ سے چاندنی چوک جیسے پھیکا پڑ گیا تھا۔

اس طرح دسوں چھوٹی بڑی بستیاں آباد ہو گئی ہیں۔ پھر بھی چاروں طرف دکانوں اور مکانوں کی مانگ ہے۔ سنا ہے نو ہزار مکان اور دکانیں اور بنیں گی۔ ان کے لئے دلی دروازے تک فصیل کو توڑ کر جگہ بنائی جا رہی ہے۔ اس میدان کا نام رام لیلا گراؤنڈ ہے یہاں نمائش یا دسہرہ کے وقت ہی چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ اب خدا نے چاہا تو بارہ مہینہ رام لیلا رہا کرے گی۔ عوامی جلسے بھی یہاں ہوا کرتے ہیں۔ آجکل سامعین کو اشتہاروں یا منادی کے

ذریعہ جمع کرنا پڑتا ہے۔ آنے والے لیڈروں کو اس معاملہ میں آسانی رہے گی۔ بغیر پہلے سے اطلاع دیئے ہی وہ ایک میز اور کرسی کے سہارے اپنی مرضی کے مطابق جب چاہیں گے تقریر کر سکیں گے۔ ان کو سننے کے لئے جنتا ہر وقت موجود رہے گی۔

دلّی میں جو وسیع تبدیلیاں ہوئی ہیں —— پہاڑ کاٹے گئے ہیں۔ جنگل صاف کئے گئے ہیں ویرانوں میں بستیاں بسائی گئی ہیں۔ جہاں چور چوری کے بعد حصّہ تقسیم کرتے تھے وہاں سائنس کی ترقی کے لئے بہت سی تجربہ گاہیں بنا دی گئی ہیں۔ ان سب تبدیلیوں کو نیک فال کہا جائے یا بری۔ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ جنگل صاف کرنا۔ ویرانہ کو بستی میں تبدیل کرنا۔ یہ سب تو تہذیب کے آثار ہیں۔ اس لئے جو کچھ ہوا ٹھیک ہی سمجھئے۔ اس پر بحث فضول ہی ہے۔ جس دیوانہ کو خشک ٹیلے دیکھنے کا شوق ہو یا کانٹوں اور جھاڑیوں سے بھرے ویرانے دیکھنے کی طلب ہو اسے دلّی چھوڑ دینی چاہئے۔ اس کے لئے ملک میں دوسری بہت سی جگہیں ہیں۔

●●

(۲۷)

دلّی کی اقتصادیات

دلّی ماہرینِ اقتصادیات کی بستی ہے۔ سدا سے رہی ہے اب ذرا زیادہ ہوگئی ہے۔ شمالی ہند میں دلّی اگر کسی چیز کا مرکز رہی ہے۔ تو وہ تھا کاروبار۔ یہاں کے کاروباری جنم سے ہی ماہرِ اقتصادیات ہوتے تھے۔ تعلیم کی انہیں خاص ضرورت نہیں تھی، یہاں کے جاہل ماہرِ اقتصادیات سے عالم اقتصادیات بھی شاید ہی ٹکر لے سکیں۔ کاروبار میں یہ لوگ اسقدر ہوشیار تھے کہ عوام انہیں ٹھگ کہنے لگے تھے۔ آجکل صورت حال تھوڑی سی بدل گئی ہے۔ تعلیم جیسی بیماری کے اثرات دلّی کے کاروباریوں پر بھی پڑ گئے ہیں۔ معاشیات و اقتصادیات کے منظم مطالعہ نے ان کی عقل کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

عام تعلیم میں تو ترقی ہوئی ہی ہے۔ دلّی میں ادھر کئی ایک خصوصی ادارے بھی کھل گئے ہیں جن کا مقصد ہی اقتصادیات کی تعلیم و تدریس ہے۔ ان اداروں میں خاص یہاں کا انڈین اسکول آف انکونومکس ہے، اس کالج میں اقتصادیات کے ماہرین تیار کئے جاتے ہیں۔ دیش کے

سبھی حصوں سے طلبا یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک بھر کی بہت سی اقتصادی انجمنوں کا مرکز بھی دلّی ہی ہے۔

یہی نہیں یہاں کے کالجوں میں اقتصادیات کی تعلیم پر بھی خاص زور دیا جاتا ہے۔ پندرہ سال سے دلّی یونیورسٹی کی یہ ایک خصوصیت رہی ہے۔ اور سب جگہ تو اقتصادیات دسویں کلاس کے بعد پڑھایا جاتا ہے یہاں اس مضمون کی تعلیم نویں کلاس سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اب دلّی کی دیکھا دیکھی اقتصادیات دوسرے صوبوں کے اسکولوں میں بھی پڑھائی جانے لگی ہے۔ مگر اس معاملہ میں پیش قدمی کرنے کا سہرا دلّی ہی کے سر ہے۔ یہاں اس کا انتظام سنہ ۱۹۳۰ء سے پہلے ہو گیا تھا۔

دلّی اقتصادیات کے معاملہ میں کیوں خصوصیت رکھتی ہے۔ اس موضوع پر کچھ دن ہوئے "لالٹین کلب" میں بڑی مزیدار بحث ہوئی۔ یہ بحث سننے کے بعد مجھے بھی اس کلب کا ممبر بننا پڑا۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ دلّی اقتصادیات میں کیوں خصوصیت رکھتی ہے۔ کیا سبب ہے کہ یہاں سبھی کا نقطہ نظر اقتصادی ہے۔ سبھی لوگ بچ بچکر خرچ کرتے ہیں۔ اور مسلسل ٹکے پیسے کے حساب میں مصروف رہتے ہیں؟

سوال پتے کا تھا۔ میں اور کیلاش دور بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ پیالہ ہاتھ میں اٹھا ہم بھی لالٹین کلب کے ممبروں کے قریب جا بیٹھے۔ جن صاحب نے سوال کیا تھا وہ سوال کی تشریح کرنے گئے: "ماننا پڑے گا دلّی کے ماحول کی اپنی ہی خصوصیت ہے۔ جس طرح بندیلکھنڈ میں ہرے بھرے درخت پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دلّی کی فضا پر اقتصادیات و معاشیات چھائے ہوئے ہیں۔ ویسے آج کل دنیا بھر میں اقتصادیات کی خاص اہمیت ہے۔ ہمارا ملک بھی دنیا کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے اس علم کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہے۔ سارے ملک میں اگر اس اثر کا بوجھ دس گنا کیا جائے تو اس میں سے صرف دلّی کے حصہ میں چھ من آجائے گا۔ اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟ آج اس کلب میں اس موضوع پر

بحث ہونی چاہیئے۔"

سوال سن کر سب لوگ غور وفکر کے موڈ میں دکھائی دینے لگے۔ کچھ منٹ بعد ہی ایک نوجوان کھڑا ہوا۔ سوال کو الٹ پھیر کر اس نے اس طرح بولنا شروع کیا: "اقتصادیات کی برتری واقعی دلی کی خصوصیت ہے۔ مگر اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ملک کے لئے اقتصادی پالیسی کو عملی جامہ یہاں پہنایا جاتا ہے۔ بمبئی۔ کلکتہ۔ کانپور وغیرہ سے بھی تاجر لوگ درآمد برآمد کے لائسنس یہیں سے لینے آتے ہیں، دلی سبھی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ کیونکہ سیاست اور اقتصادیات ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اس لئے دلی اقتصادیات کا مرکز بھی اتفاق سے بن گئی ہے۔ معاشی و اقتصادی سرگرمیاں یہاں اسقدر بڑھ گئی ہیں کہ دلی کے عوام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ ان کا رنگ سبھی پر چڑھ گیا ہے۔ جیسے برسات میں پانی سڑکوں یا باہر میدان میں برستا ہے۔ گھروں میں تو نہیں پڑتا۔ لیکن پھر بھی برسات گھر کے اندر رکھی چیزوں کا رنگ روپ بدل ڈالتی ہے۔ آلو میں پٹاخہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ سڑنے لگتا ہے۔ پیاز کی داڑھی نکل آتی ہے۔ چارپائی اونچی نیچی ہو کسرت کرتی دکھائی دیتی ہے۔ سنبھال کر رکھے جوتوں لکڑی اور چمڑے کی چیزوں میں پھوئی لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے گھر میں جنگل کی سی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے نہ؟ بس ایسی ہی معاشی و اقتصادی سرگرمیوں کے سبب دلی کے باشندوں کا چال چلن۔ عادت و مزاج بدل گئے ہیں۔ کوئی چاہے کسی کام میں لگا ہو۔ کسی نہ کسی بہانہ اس کی توجہ اپنی۔ اپنے گھر کی۔ اپنے دلیش اور شاید پوری دنیا کی معاشیات و اقتصادیات کی طرف مسلسل لگی رہتی ہے جیساکہ سب جانتے ہیں عادت جب پختہ ہو جاتی ہے تو مزاج کا جز بن جاتی ہے۔ نوابوں کے زمانہ میں اودھ کے لوگ امیرانہ عادت کے ہو گئے تھے۔ اب دلی کے زیادہ تر باشندے معاشی و اقتصادی نقطہ نظر کے مائل ہو گئے ہیں۔"

اس تقریر پر ۱۵ منٹ تک گفتگو اور بحث ہوتی رہی۔ اس کے نتیجہ میں ایک اور تجویز

سامنے آئی۔ ایک ادھیڑ عمر کے صاحب جو پیشہ سے وکیل معلوم ہوتے تھے ایکدم کچھ کہنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا: "شریمان وکرم جی نے جو کچھ کہا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن دلی کے باشندوں کے معاشی مزاج کے سلسلہ میں جو پس منظر انہوں نے دیا ہے اس میں ایک زبردست کمی رہ گئی ہے۔ بھلا جس شہر میں دیش کی سب سے بڑی قانون ساز اسمبلی (پارلیمنٹ) کا اجلاس ہوتا ہو۔ وہاں کے لوگوں کا نقطۂ نظر معاشی و اقتصادی کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ پارلیمنٹ کے سامنے کسی نہ کسی شکل میں سال میں چار بار ملک کا بجٹ رہتا ہے جو قطعی معاشی موضوع ہے۔ سرکار مسلسل اپنے بہی کھاتہ میں الجھی رہتی ہے۔ کبھی سرکاری محکموں میں کفایت شعاری کا ذکر ہوتا ہے کبھی ترقی اور پھیلاؤ کے منصوبوں کے لئے روپیہ مانگا جاتا ہے۔ کبھی پانچ سالہ یا سات سالہ قرضے جاری کئے جاتے ہیں۔ دلی کے لوگ حکومت کے بہت قریب ہیں۔ سرکار کی کوئی ایسی کارروائی نہیں جس کا یہاں کے لوگوں پر بلاواسطہ اثر نہ پڑتا ہو۔ میں ذاتی طور پر واقف ہوں سرکار کے معاشی بحران کو دیکھ کر دلی کے سیکڑوں خاندانوں کی ہمت بندھتی ہے معاشی انتظام بھی یہاں کے لوگ سرکار سے ہی سیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں دلی کے لوگوں کے معاشی (اقتصادی) مزاج کا سب سے بڑا سبب سرکار اور دلی کے عوام کے درمیان سیدھا تعلق ہے۔"

کیلاش اور مجھے ان باتوں میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ لالٹین کلب کے ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی کیلاش برابر بولنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ ہر بار مجھے انہیں زبردستی بٹھانا پڑتا تھا۔ لیکن جیسے ہی ورما جی بیٹھے کیلاش ایکدم اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے صدر سے بولنے کی اجازت چاہی۔ لالٹین کلب کی تو بنیاد ہی وسیع النظری کے اصول پر قائم ہے۔ کیلاش کو فوراً اجازت مل گئی۔ اور باعزت ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس متنازعہ مسئلہ پر کیلاش نے اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا: "میں لالٹین کلب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے ایسے اہم قومی سوال پر گفتگو کا اہتمام

گیا ہے۔ ابھی ابھی دو مقرّر اس مسئلہ پہ کافی روشنی ڈال چکے ہیں لیکن میری عرض یہ ہے کہ کچھ بنیادی باتوں کی طرف ابھی کلب کی توجہ نہیں گئی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اقتصادیات لفظ کا جو مطلب دوسرے شہروں کے لوگ لیتے ہیں۔ دلّی کے لوگ اس کا وہ مطلب نہیں لیتے۔ یہاں کے لوگوں کیلئے اقتصادی و معاشی لفظ کے معنی وسیع تر ہیں۔ مذہب۔ تہذیب۔ سماجی خدمت۔ اخلاق وغیرہ سب الفاظ اس ایک لفظ میں پنہاں ہیں۔ اور اس کا ایک جز ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں بیداری ہے رواداری ہے۔ اور ایک عجیب و غریب قسم کی عوامی غیر جانبداری ہے۔ یہاں کے لوگ کفایت شعار ہیں۔ چوری کئے بغیر وہ فضول خرچ ہو ہی نہیں سکتے۔ ان میں سلیقہ ہے۔ مگر سمجھداری کے ساتھ۔ وہ منتظم ہیں۔ لیکن وسیع النظری کے ساتھ۔

"ایک مثال دوں تو آپ میرا مطلب سمجھ سکیں گے۔ میرے پاس میرے دوست ہیمنت بیٹھے ہیں انہیں کو لیجئے۔ کمال کے سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔ ایک ایک پیسے کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ یہ سگریٹ کافی پیتے ہیں۔ سونے تک چار پیکٹ پر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ دیا سلائی کی ایک ڈبیہ چار دن چلاتے ہیں۔ ماچس کی تیلیوں کو بچانے کے لئے یہ سگریٹ سے سگریٹ سلگاتے جاتے ہیں کلکتہ یا لکھنؤ کے لوگ شاید انہیں فضول خرچ کہیں۔ لیکن دلّی کا پیمانہ دوسرا ہے۔ دیا سلائی کی تیلیوں میں کفایت کر سکنے کی وجہ سے وہ کفایت شعار سمجھے جاتے ہیں۔ میرے خیال سے یہ ٹھیک ہی ہے۔"

یہ الفاظ سن کر لالٹین کلب کے ممبران کیلاش کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ ان کی باتوں کا ڈھنگ ہی کچھ اور تھا۔ چاروں طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔ باتوں باتوں میں مشاعرہ کا سا سماں بندھ گیا۔ صدر نے کیلاش کو مُبارکباد دی اور اپنی تقریر جاری رکھنے کا اشارہ کیا:۔

"دوستو! دلّی والے انسان ہیں۔ چھوٹا بڑا کیسا ہی کام ہو وہ اسے ایک اندازے کے

ساتھ کرتے ہیں۔ ایک خاص ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ مان لیجئے یہاں کے کسی پریشان شخص کو روپیہ کی ضرورت ہے۔ وہ فوراً ادھار لینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ادھار دینے والے بھی یہاں اتنے ہی ہیں جتنے ادھار لینے والے۔ دونوں کا میل ہوتے دیر نہیں لگتی۔ قرض دینے والے کو سود لیتے ضرور کچھ ہچکچاہٹ ہوتی ہے مگر لینے والا بڑی فراخدلی سے سود دینے پر اصرار کرتا ہے۔ ہر ماہ سود کی رقم چکانے کو دلّی کا گرہستی اتنی ہی اہمیت دیتا ہے جتنا دودھ یا ایندھن کا بل چکانے کو۔ کیونکہ سارا کام منصوبہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے نقصان میں کوئی بھی نہیں رہتا ہے۔ قرض لینے اور دینے والے کے جیسے خوبصورت تعلقات دلّی میں دیکھنے کو ملتے ہیں ویسے سورگ لوک (جنت) کے رہنے والوں میں بھی شاید ہی ہوں۔

"یہ سب دارالسلطنت کی معاشی واقتصادی خصوصیات کی برکتیں ہیں۔ یہاں کے لوگ معاشیات واقتصادیات کے اسقدر اچھے طالب علم ہیں کہ وہ دینداری کو خوشحالی کی علامت مانتے ہیں۔ یہی سب علم اقتصادیات کا بھی کہنا ہے۔"

کیلاش کی باتوں میں سچائی کی جھلک پاکر سب خوش ہو اٹھے اور تالیوں کی آوازوں سے انہوں نے کلب سر پر اٹھا لیا۔ کیلاش بیٹھ جانا چاہتے تھے۔ پر لوگ انہیں بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ چاروں طرف سے یہ فرمائش ہو رہی تھی کہ وہ کچھ اور کہیں۔ کیلاش ایسے شرم والے کہاں جو مظاہرہ سے مطمئن ہو کر چپ رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے۔ رومال سے منہ صاف کر وہ کھڑے ہو گئے۔ اور اسی موضوع پر پھر بولنے لگے:۔ "علم اقتصادیات کے بنیادی اصولوں کو جیسا دلّی والوں نے سمجھا ہے۔ دنیا میں شاید کسی اور نے نہیں سمجھا۔ ذاتی ضرورتوں۔ علم معاشیات واقتصادیات اور اپنے ذرائع کے درمیان انہوں نے مکمل ہم آہنگی قائم کر لی ہے۔ اس ہم آہنگی سے انہوں نے اپنی کمیوں پر فتح پائی ہے اور امیری غریبی کے فرق کو سدا کے لئے دفن کر ڈالا ہے کسی بھی شخص کو جب

کوئی قیمتی چیز خریدنی ہوتی ہے تو یہ سوال نہیں اٹھتا کہ وہ اسے خرید سکتا ہے یا نہیں۔ صرف ایک ہی سوال دائرہ فکر میں آتا ہے وہ یہ کہ اس خاص شخص کو اس خاص چیز کی کہاں تک ضرورت ہے اگر اس کا جواب ملے کہ واقعی ضرورت ہے تو وسائل کی دلدل میں پھنسے بغیر ہی اسے حاصل کر لیا جاتا ہے۔ وہ کیسے؟ قسطوں پر خرید کر۔ دور اندیش ماہرین اقتصادیات اس پیچیدہ مسئلہ کا حل مدت ہوئی بتا چکے تھے۔ اگر اس پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ تو اس میں دلی والوں کا کیا قصور۔ یہ لوگ حساب میں بھی اسیقدر ماہر ہیں جسقدر کہ علم معاشیات میں۔ لیکن کسی خاص چیز کی قیمت کو تیس یا چالیس میں تقسیم کر دیتے ہیں اور خراماں خراماں قسطیں دیئے جاتے ہیں قسطوں کی ادائیگی میں کوئی بھول چوک ہو تو دیکھ لی جاتی ہے۔ فی الحال چیز تو اپنی ہو جاتی ہے۔ موٹر کار سے لیکر فاؤنٹین پین اور گرم کپڑوں تک دلی میں سبھی کچھ قسطوں پر مل جاتا ہے۔ ان آسانیوں سے فائدہ نہ اٹھا کر اگر کوئی پھٹے حال رہتا ہے تو اسے عقلمند نہیں کہا جا سکتا۔ دلی کی مقدس سرزمین ایسے اشخاص کو اکھاڑ پھینکتی ہے۔

"لگے ہاتھوں ایک اور بات کا ذکر بھی کر دوں۔ دلی کی زندگی میں مادی عنصر کو بہت دخل ہے۔ اسی سبب یہاں کی زندگی میں اقتصادی برتری پائی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں معاشی مشکلات کا ذکر یہاں کی زندگی کا معمول بن گیا ہے۔ فراخدلی اور تعلیم یافتہ ہونے کے سبب لوگ ان مشکلات سے کتراتے نہیں ہیں۔ ان سے الجھنے میں ہی لطف آتا ہے۔ دلی کا تعلیم یافتہ طبقہ آجکل اس سلسلہ میں خاص تحقیق کر رہا ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے۔ بین الاقوامی خزانہ و بینک اور دوسری غیر ملکی معاشی تنظیموں کی اقتصادی امداد سرکار کے ساتھ ساتھ افراد کو بھی ملنی چاہیئے بین الاقوامی امداد سے جو دلی میں دار المطالعہ کھلا ہے وہ بہت اچھا ہے۔ لیکن راجدھانی میں بہت سے عالم ایسے ہیں جن کے ذاتی دار المطالعہ بھی ہیں۔ ان میں کچھ ایسے سمجھدار ہیں جو اپنے وسائل کا خیال نہ کرتے ہوئے کتابیں خرید بیٹھتے ہیں اور کتب فروشوں کے بل سے پیچھا چھڑانا

ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی معاونت کرنا تو بین الاقوامی اداروں کا فرض ہونا چاہیئے۔

"میرے ایک دوست کولمبو میں دو ماہ کی چھٹی گذار کر دلی پہونچے ہیں۔ کچھ دن ہوئے میں ان سے ملاقات کرنے گیا۔ تو انہیں بہت مصروف پایا۔ معلوم ہوا وہ ایک درخواست تیار کرنے میں لگے تھے۔ یہ درخواست بین الاقوامی مالی خزانہ کے صدر کے نام لکھی گئی تھی۔ جن سے اپیل کی گئی تھی کہ غیر ملکی سفر کی وجہ سے درخواست کنندہ کا براہ ال ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ بین الاقوامی امداد کا حقدار ہے۔ آج یہ بات کتنی ہی مضحکہ خیز معلوم ہو۔ پر آپ کو دکھادوں گا ایک مہینہ میں ہی یہ کوشش رنگ لائے گی۔ اور مختلف ملکوں کی سرکاروں کی طرح دلی کے باشندے بھی بین الاقوامی خزانہ سے قرض لے سکے گیں۔ میں دیکھ رہا ہوں میری بات سے کچھ لوگ پریشان دکھائی دینے لگے ہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ دلی شہر کی حدود میں فکر و پریشانی نام کی چیز کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں کے ماحول میں فراخی ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہ فراخدلی اور وسیع النظری کی عمارت جن مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہے۔ وہ بنیادیں ہیں۔ اقتصادیات کی معلومات۔ عقلمندی اور برابری کا شوق —— ان تینوں میں برابری کا اثر لوگوں پہ زیادہ ہے۔ دلی میں اونچ نیچ۔ چھوٹائی بڑائی ڈھونڈے سے ملے تو ملے آپ سے آپ تو کہیں دکھائی دیتی نہیں۔ سرکاری دفتروں میں انگریزوں کے زمانہ میں جو بھید بھاؤ تھا۔ وہ اب مٹ چکا ہے۔ پھر بھی سرکاری ملازم کو گرا ہوا شخص نہیں کہا جا سکتا۔ سبھی افسر ہیں۔ صرف ان کے مدارج میں فرق ہے۔ کوئی ایک درجہ کا ہے کوئی درجہ دوئم کوئی درجہ سوئم اور کوئی درجہ چہارم۔ کوئی بھی ہو ہیں سب افسر۔

"انسانی سماج کے دائرہ سے نکلکر برابری کا جادو بیجان چیزوں تک پر چھایا ہوا ہے۔ آج صبح ہی میں نے ایک آدمی کو زور سے چلاتے ہوئے سنا ہر مال ڈیڑھ روپیا اس کی ریڑھی چیزوں سے

بھری تھی۔ سنئے ان میں کیا کیا چیزیں تھیں۔ ایک سیر چینی کا لفافہ۔ ایک سیر پاکستانی نمک کا ڈھیلا۔ ایک سیر پاپڑ۔ ایک سوتی بنیان۔ فاؤنٹین پین اور پین کی سیاہی۔ ربڑ کی گیند کھلونے وغیرہ۔ ہر چیز ڈیڑھ روپیہ میں۔ ذرا سوچئے برابری کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ نمک اور چینی ایک بھاؤ بکتی ہیں۔ اس کے بعد تصور کرنے کے لئے کچھ رہ ہی نہیں جاتا۔ مساوات کی ایسی فضا میں جو لوگ رہیں گے ان میں اونچ نیچ کے جذبات کو ڈھونڈنا اپنی ہنسی اڑانا ہے۔ دلّی میں رہنے والا بر لا ہی کوئی ایسی غلطی کرے گا۔"

کیلاش کی بات لوگوں کو اسقدر پسند آئی کہ انہیں کندھوں پر اٹھا لیا گیا۔ ہوٹل کے سب لوگ وہاں آکر جمع ہو گئے۔ ایک ممبر نے فوراً تجویز رکھی کہ آئندہ سال کے لئے کیلاش جی کو لالٹین کلب کا صدر چنا جائے۔ اتفاق رائے سے یہ تجویز منظور کی گئی۔ کیلاش اور میں لالٹین کلب کے ممبر ہونا تو منظور کر ہی چکے تھے۔ ہم نے اسی وقت سال بھر کا چندہ دیدیا۔

کیلاش کی رہنمائی میں لالٹین کلب آجکل اقتصادیات کے میدان میں تلاش و تحقیق کر رہا ہے۔ ریاضی کے اصولوں کو غلط ثابت کئے بنا کیسے بھاؤ کو سہتات میں کس طرح بدلا جائے۔ اس موضوع پر کلب کی طرف سے کچھ کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ جس کی آجکل دلّی میں سبھی جگہ شہرت ہے۔

(۲۸)

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے؟

کسی زمانہ میں مجھے سینما دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ہفتہ میں ایکبار فلم دیکھنے کا اصول سا بن گیا تھا۔ کونسی فلم اچھی ہے اور کونسی بری اس بارے میں کیلاش کی رائے ہی میری رائے ہوتی تھی۔ کیونکہ فلم کے بارے میں میری اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ ادھر پانچ چھ سالوں سے میں نے فلمیں بہت کم دیکھی ہیں۔ کچھ تو شوق کم ہو گیا ہے کچھ وقت ہی کم ملتا ہے۔ تیسرے مجھے ہمیشہ سے جلدی سو جانے کی بیماری ہے۔ اب یہ بیماری اور بھی بڑھ گئی ہے جب شریف آدمی سینما سے گھر لوٹتے ہیں۔ میں آرام سے سویا ہوتا ہوں۔

پچھلی سردیوں میں ایک دن کیلاش نے اصرار کیا کہ ریوالی سینما گھر میں فلم دیکھی جائے۔ وہاں انگریزی کی ایک اچھی فلم چل رہی تھی۔ اس فلم کی دلی میں کافی شہرت تھی۔ شام کے چھ بجے تک سب کام ختم کر کے ہم دونوں ایک ہوٹل میں چائے پینے بیٹھ گئے۔ چائے پیتے پیتے کیلاش کو اچانک خیال آیا کہ انہیں مان سنگھ روڈ پر کسی شخص سے ٹھیک ساڑھے پانچ بجے ملنا تھا۔ جلدی

جلدی چائے پیکر وہ میری کار میں چلے گئے۔ چونکہ میں ریوالی کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس لئے میں نے ان سے ٹھیک ساڑھے چھ بجے ریوالی آنے کے لئے کہا۔

کچھ دیر میں میں نے بھی چائے ختم کی اور ریوالی کی طرف چلدیا۔ راستہ میں چلتے چلتے مجھے یونہی خیال آیا کہ درزی سے پوچھتا چلوں کہ میرے کپڑے تیار ہو گئے یا نہیں۔ درزی کی دکان میرینا ہوٹل کے ٹھیک سامنے تھی۔ میں ادھر جا نکلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب اسی درزی کے یہاں اپنے سوٹ کا ناپ دے رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایسے بات کی جیسے کوئی پرانے دوست سے بولتا ہے میں نے بھی ہنسکر ان کی بات کا جواب دیا۔ انہوں نے مجھے وہ کپڑا دکھلایا۔ جس کا وہ سوٹ بنوانے جا رہے تھے۔ بہت نفیس سرج تھی۔ میں نے پوچھا کیا بھاؤ لی ہے۔ انھوں نے کہا ۲۷ روپیہ گز۔ یہ کہکر وہ رکے نہیں بولتے ہی چلے گئے:-

"اونی کپڑوں کا آجکل کوئی بھاؤ نہیں۔ جو کپڑا ایک جگہ ۱۲ روپیہ گز ملتا ہے۔ اسی کپڑے کا دام دوسرا دوکاندار ۲۵ روپیہ گز بتلاتا ہے۔ ایسے دکاندار بھی ہیں جو ۲۰ روپیہ گز کا کپڑا ۱۵ روپیہ گز میں دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ کپڑے کا اپنا کوئی بھاؤ نہیں۔ دکاندار پر سب کچھ منحصر ہے۔ اگر اس کا کام جما ہوا ہے اور اسے مال بیچنے کی جلدی نہیں تو پہلے ہی دگنے دام مانگے گا۔ اگر کوئی دکاندار یہ سوچتا ہے کہ اس نے کپڑے کا کاروبار شروع کر کے غلطی کی ہے اور اصل میں اسے بجلی کے سامان کا کام کرنا چاہئے تھا۔ تو پھنسے ہوئے پیسے کو نکالنے کے لئے وہ خسارہ پر بھی بیچنے کو تیار ہو جائے گا۔ دلّی میں ایک چوتھائی کے قریب کپڑے کے ایسے دکاندار ہیں۔ جنھوں نے محض تجربہ کیلئے کپڑے کی تجارت شروع کی تھی۔ مگر جنھیں بعد میں احساس ہوا کہ انھوں نے غلطی کی۔ اصل میں انہیں کوئی اور کام کرنا چاہئے تھا۔ ایسے دکانداروں سے کپڑا سدا سستا ملتا ہے۔"

وہ بولتے ہی گئے:-

"اب سوال یہ ہے کہ ایسے دکانداروں کی پہچان کیا ہے؟ اسی پر سب کچھ منحصر ہے۔ میں نے پندرہ دن گھوم کر یہ کپڑا خریدا ہے۔ بتاؤں کہاں سے لیا ہے؟ آپ سنکر حیران ہوں گے۔ یہ میں نے چاوڑی بازار سے لیا ہے وہاں سب دکانیں لوہا۔ تانبا اور پیتل کے سامان کی اور کاغذ کے تاجروں کی ہیں۔ نئی سڑک پر کونے میں برتن کی ایک دکان ہے۔ اس دکان کے سامنے ادھیڑ عمر کا ایک شخص دو چار اونی کپڑے کے تھان لئے بیٹھا تھا۔ برتن والے کی دکان گاہکوں سے بھری تھی۔ یہ آدمی خالی بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ میں ایکدم بھانپ گیا کپڑے والا کھٹے حال ہے۔ سردی کے موسم میں جو آدمی سوتی کپڑا پہنکر اونی کپڑا بیچتا ہے وہ ضرور تنگ حال ہوگا۔ میں نے سوچا اسی لئے یہ بیچارہ سگریٹ سے بیڑی پہ آگیا ہے اور پھر وہ صاف دیکھ رہا ہے کہ کپڑے کا کوئی گاہک ہی نہیں۔ جبکہ برتن خریدنے والوں کی قطار بندھی ہوئی ہے۔ بس مجھے یقین ہو گیا وہ آدمی کپڑے کے کام سے اکتایا ہوا ہے۔ سستا کپڑا خریدنے کا یہی موقع ہے۔"

ایک لمحہ سانس لے کر انہوں نے پھر بولنا شروع کیا:۔

"پوری تسلی کر میں اِس دکاندار کی طرف بڑھا۔ اس کے پاس تین تھان تھے۔ سبھی سوٹ کے لئے موزوں کپڑے تھے۔ میں نے ایک تھان اٹھایا اور دام پوچھا۔ اس بھلے آدمی نے جو جواب دیا اس سے میرے خیال کی پوری تصدیق ہو گئی۔ دبی آواز سے اس نے کہا، "پہلے آپ کپڑا دیکھیں کتنا گف اور بھاری ہے ایک ایک گز پر ولایت کی مہر لگی ہے۔ بھاؤ کی کوئی بات نہیں۔ آپ جو چاہیں سو دیدیں۔ آجکا بازار تو بہت چڑھا ہوا ہے۔ مجھے اس کپڑے کو نکالنا ہے۔ ۲۷ روپیہ گز لگالوں گا۔"

ایک اجنبی آدمی سے یہ طویل کہانی سن کر مجھے دل ہی دل میں ہنسی بھی آئی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر انہیں نمستے کی اور کہا: "مجھے ریوالی جانا ہے۔ آپ سے ملکر بڑی خوشی ہوئی۔" ہنستے ہوئے انہوں نے آگے ہاتھ بڑھایا۔ اور زور سے میرے ہاتھ دباتے ہوئے بولے: "میرا نام کلونت رائے ہے۔

میں نکلسن روڈ پر رہتا ہوں۔ زندگی میں کبھی ایسی گندی جگہ پر نہیں رہا۔ پر مجبوری ہے۔ ابھی بھی سینکڑوں دوستوں سے اچھا ہوں۔ ویسے دیکھا جائے تو وہ جگہ رہنے کی نہیں۔ وہاں تو گودام ہونے چاہئیں۔ رہنے کی جگہ تو نئی دلی ہے اور میں دلی آیا ہی اس ارادہ سے تھا کہ نئی دلی میں رہوں گا۔ زور بھی بڑا مارا۔ کئی دن ادھر ادھر گھوما۔ بہت لوگوں کی مدد لی اور کافی پٹرول پھونکا۔ پر جب کام بنتا نہ دیکھا تو کشمیری گیٹ کی طرف جا نکلا۔ سنتا تھا کہ وہاں کئی مکان خالی ہیں۔ دلی کی یہ حالت ہے۔ اب کیا کہوں آپ تو شکل وصورت سے دلی والے جان پڑتے ہیں۔ مشکلات تو آج کل سبھی شہروں میں ہیں۔ پر دلی کی بات کچھ نرالی ہے۔ یہاں سب کچھ چیزیں ہیں پر اصل میں کچھ بھی نہیں۔ مکانوں کی یہاں بڑی تنگی ہے۔ پر ڈھونڈنے والے کے لئے کوئی کمی نہیں۔ دلی میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جسے پیسہ نہ سلجھا سکتا ہو۔ آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کو ریوالی جانا ہے۔ میں آپ کو روکنا نہیں چاہتا۔ پر یہ کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ یہاں کے سینما گھر بھی خوب ہیں تین درجن کے قریب سینما گھر ہیں۔ جہاں جاؤ ایسا جان پڑتا ہے کہ ساری دلی وہاں امڈ پڑی ہے مجھے بھیڑ سے نفرت ہے۔ اس لئے سینما دیکھے مہینوں بیت چکے ....“

میرا ہاتھ کلونت رائے جی نے ابھی تک نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے نہایت نرمی سے پھر اجازت مانگی۔ اور دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ جب چلنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ جس کام سے آیا تھا وہ تو کیا ہی نہیں۔ درزی سے یہ پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ کپڑے سل گئے یا نہیں۔ میں نے دیوا سنگھ کو آواز دی۔ جواب میں بول اٹھے کلونت رائے ” دیکھا آپ نے یہاں کے درزیوں کو! آپ کے کپڑے سی رہے ہیں اور اسقدر بھی تمیز نہیں کہ آپ آئے ہیں تو یہ لوگ دکان پر ٹھہرے رہیں۔ سچ پوچھئے تو ذات پات بھی بھگوان نے ٹھیک ہی بنائی ہے۔ ہم لوگ کتنے ہی لکھ پڑھ جائیں ذات پات کے فرق کو تو ماننا ہی پڑتا ہے۔ اس بات پر دیوا سنگھ سے میرا کئی مرتبہ جھگڑا ہو چکا ہے۔ اچھے خاصے کپڑے سیتا ہے۔ اس کی پتلون کی تراش کا تو جواب ہی نہیں۔ چلتے وقت کریز ایسی سیدھی گرتی ہے

جیسے بھاگتے گھوڑے کی ٹانگیں ایک دوسرے کے سامنے پڑتی ہیں۔ مجال ہے کہیں بل پڑ جائے۔ پر یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ آدمی لاپرواہ ہے۔ اس کی توجہ گاہکوں کے حصہ میں آتی ہی نہیں۔ تمام تر توجہ کپڑے پر ہی رہتی ہے اخلاق کی یہ کمی مجھے بہت کھلتی ہے۔ لکھنؤ میں کوئی اس طرح کا کاروبار کرے تو کوڑے کھائے۔ وہاں کا درزی کٹائی سلائی میں چاہے کتنا ہی کچا ہو۔ پر بول چال میں خطا نہیں کھاتا۔"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ اس وقت ساڑھے سات بجے تھے۔ میں نے چلتے چلتے کہا: "بڑی قیامت ہو گئی۔ کیلاش بیچارا تو مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان ہو گیا ہوگا۔ وہ بھی کہے گا اچھے دوست سے پالا پڑا ہے۔"

"اجی دوست کی بھی خوب رہی۔" کلونت رائے جی ٹپک پڑے۔ "یاروں دوستوں میں تو ایسی باتیں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ میں آپ سے کیا کہوں۔ میری غلطی سے ایکبار میرے دوست کو کتنا حیران ہونا پڑا۔ ہم دونوں نے نوچندی کا میلہ دیکھنے کے لئے میرٹھ جانے کا فیصلہ کیا۔ گاڑی کے ٹکٹ پہلے ہی منگوا لئے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اسٹیشن پر گیارہ بجے مل جائیں۔ اسی وقت ایک گاڑی میرٹھ جاتی تھی۔ ٹکٹ میرے پاس تھے۔ نہ جانے کس دھن میں میں دس بجے ہی اسٹیشن پہونچ گیا، میرٹھ جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ مجھے کچھ دھیان ہی نہیں رہا اور میں گاڑی میں سوار ہو گیا۔ جب ١١ بجے میرے دوست مجھے اسٹیشن پر تلاش کر رہے تھے تو میں میرٹھ جا اترا تھا۔ کئی دن تک شکوے شکایات رہے۔ پر دوست دوست ہی ہوتا ہے معاملہ خود بخود ہی رفع دفع ہو گیا۔ ایسی دوستی کیسی جو چھوٹی چھوٹی باتوں میں پھنس کر ختم ہو جائے۔ بھولیں تو ہوا ہی کرتی ہیں۔ اور ہونی بھی چاہیئں۔ یہ دوست کا کام ہے کہ ان کو درگذر کرے۔ سوچتا ہوں آپ کے دوست بھی کم سمجھدار نہ ہوں گے یا تو گھوم پھر کر واپس چلے گئے ہوں گے۔

اور گول کمرہ میں بیٹھے آگ تاپ رہے ہوں گے۔ یا اس وقت فلم سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ ہم اور آپ بھی برے نہیں۔ مزے میں باتیں ہو رہی ہیں۔ ایسا ہی خیال ہے تو چلو ریوالی کا چکر لگا لیں۔"

کلونت جی نے دوستی کی جو تشریح کی اس پر بحث کرنے کے لئے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں ایک دم ریوالی کی طرف لپکا۔ پیچھے پیچھے کلونت جی چل دیئے۔ کچھ دور گئے تھے کہ کلونت جی نے بڑے زور سے "ہیلو" کہا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ بولے: "میرے پرانے دوست میجر کرپال سے ملئے۔ یہ میجر کرپال ہیں اور یہ (میری طرف اشارہ کر کے) میرے دوست ہیں" میں نے اپنا نام ابھی تک بتایا ہی نہیں تھا۔ پر انہیں اس کی زیادہ فکر نہ تھی۔ وہ بات کرتے گئے:۔ "میجر کرپال سال بھر کشمیر رہ کر ابھی لوٹے ہیں۔ یہ بھی کمال کے آدمی ہیں۔ ہمارے لئے انہوں نے وہاں سے دسیوں چیزیں بھیجی ہیں۔ پر اپنا پتہ کبھی نہیں لکھا صرف ان کا تار آیا تھا کہ دلی آ رہے ہیں۔" (میجر کرپال کی طرف دیکھ کر) "یہ کہاں کی شرافت ہے کہ دلی پہونچنے کا ٹھیک وقت تار میں نہیں لکھا۔ ہم ہوائی جہاز کے اڈہ پر آپ کا استقبال کرتے۔ خیر کشمیر کی بات کیجئے۔ یہ تو اچھا ہوا۔ لڑائی بند ہو گئی۔ لڑائی میں رکھا ہی کیا ہے؟ ایک نہ ایک دن صلح تو ہونی ہی تھی۔ سو جتنی جلدی ہو گئی اچھا ہے۔ یہ تو بتایئے ہمارے قبضہ میں کشمیر کا کتنا حصہ ہے؟ اور پاکستان کے قبضہ میں کتنا؟ کشمیر کے لوگ ہماری فوجوں کی تواضع تو سنا ہے خوب کرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہمارے فوجیوں نے ہی انہیں دوزخ سے بچایا ہے۔ پھر وہ کیسے نہ انہیں پوچھیں گے میں نے سنا ہے ہمارے فوجیوں نے کشمیری عوام کی خوب خدمت کی ہے۔ اور اسی لئے وہ کافی مقبول ہو گئے ہیں۔ راحت و آرام میں اگر کوئی کسی کے ساتھ بھلائی کرے تو شاید اسے آدمی بھلا دے۔ مگر دکھ میں کسی کا احسان کب کوئی بھولتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کشمیر میں ہماری آخری فتح ہو چکی ہے۔ جب کبھی بھی

رائے عامہ معلوم کی جائے گی۔ سارے کشمیری ہماری طرف ہی ہاتھ اٹھائیں گے ....."

ان بہت سے سوالوں کا جواب دینے کیلئے میجر صاحب کو بھی اخلاقاً کچھ کہنا پڑا۔میں نے سوچا میجر صاحب سمجھدار و سنجیدہ انسان ہیں ان کی بات نہ سننا بھی بداخلاقی ہوگی۔ میں نے دل میں سوچا جب کلونت کی آندھی و طوفان جیسی بکواس کے سامنے میں نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ تب ایک شریف آدمی کی بات سنے بغیر کیسے چل دوں۔ اس لئے جبتک میجر کرپال بولتے رہے میں چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ وقت کی جو بچت کرنی تھی وہ میں نے اپنے اوپر کر لی۔ یعنی میں کچھ نہیں بولا۔ جیسے ہی میجر کرپال خاموش ہوئے۔ میں نے کلونت کے سامنے ریوالی جانے کی تجویز پھر پیش کی۔ اس امید سے کہ ان حضرت کو ایک اور دوست مل گیا ہے اور اب وہ میرا پیچھا چھوڑیں گے۔ دونوں کو نمستے کہتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔ ایک منٹ بعد دیکھتا کیا ہوں کہ کلونت جی پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔

جوں تیوں کر کے ہم لوگ ریوالی پہونچے۔ وہاں کی گھڑی میں نو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ ہم دونوں ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اور شو ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ٹھیک دس منٹ بعد لوگوں کی بھیڑ باہر نکلنے لگی۔ میری نگاہیں باہر نکلنے والے تماش بینوں پر لگی تھیں۔ کیلاش کو دیکھتے ہی میں اس کی طرف لپکا۔ جیسے ہی میں نے کیلاش کا ہاتھ پکڑا۔ کلونت جی بولے:" اچھا! یہ ہیں آپ کے دوست۔ کیوں جی کیسی رہی پکچر؟ ارادہ تو ہم لوگوں کا بھی تھا۔ پر دیوا سنگھ درزی کی مہربانی سے ہم باہر ہی رہ گئے۔ آپ کے دوست آپ کے بارے میں بہت فکرمند ہیں۔ پر شاید اب انکی فکر دور ہوگئی ہوگی۔ ان کو ڈر تھا کہ شاید آپ کو پریشانی ہوئی ہوگی، یہ ان کا بھولا پن ہے۔ میں کہتا ہوں گھاٹا انہیں کو رہا۔ آپ پھر بھی نفع میں رہے کہ پکچر تو دیکھ لی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہی ہے۔ چلئے اچھا ہوا جو آپ لوگوں کا میل ہو گیا۔ اچھا، مجھے اجازت۔ نمستے۔"

نمستے کے ساتھ کلونت نے مجھے اپنا تعارفی کارڈ دیا جس پہ لکھا تھا۔ "کلونت رائے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایس۔ جی۔ ڈی جنرل ایڈوائیزر نکلسن روڈ۔ دلّی"۔ جیسے ہی وہ آنکھ سے اوجھل ہوئے کیلاش نے میری طرف دیکھا۔ ان کی پیشانی پر ابھی بھی بل پڑے ہوئے تھے۔ وہ بولے:۔ یہ جّح ۔ جح تم نے کہاں سے خریدی ؟ تم بھی عجب احمق ہو اگر اس بھلے آدمی سے باتیں کرنی تھیں تو مجھے کہہ تو دیا ہوتا۔ میں نے بیکار میں دو ٹکٹ خریدے ۔ اور ساڑھے چھ تک تمہیں ڈھونڈتا رہا"۔

میں نے اپنے بچاؤ میں کچھ بھی کہنا غیر ضروری سمجھا۔ کیلاش کو خود کلونت کی شخصیت کی ایک جھلک مل چکی تھی۔ رہی سہی باتیں میں نے انہیں بعد میں سمجھا دیں کہ کلونت میں اور طغیانی سے امڑتی ہوئی ندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے منہ سے الفاظ اسقدر آسانی سے نکلتے ہیں جیسے چکّی سے آٹا۔ سننے والے کو سمجھنے میں تکلیف ہو تو ہو۔ ان کو بولنے میں خاص آنند حاصل ہوتا ہے۔

کلونت جی سے میری اور کیلاش کی اب بھی کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے۔ ہم ان کے یہاں اسی وقت جاتے ہیں جب بالکل بیکار ہوں۔ پر بیماری کے دنوں میں ہم انہیں ڈاکٹر سے بھی پہلے بلاتے ہیں۔ بات سننے کا لطف جو بستر پہ لیٹے مریض کو حاصل ہوتا ہے وہ کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔

●●

(۲۹)

کھنڈر کلب[1]

دلّی میں کوئی بھی باہر کا آدمی آکر دس پندرہ دن رہے تو راجدھانی کی زندگی میں اسے کچھ باتیں عجیب و غریب معلوم ہوں گی۔ ہوٹلوں میں۔ کلبوں میں۔ سینما گھروں میں اور سڑکوں پر اسے کچھ آدمی ایسے ضرور ملیں گے جو بظاہر کچھ نہیں کرتے۔ مگر رہتے نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہیں۔ ان میں سبھی گھر کے رئیس ہوں یہ بات بھی نہیں ہے۔ وہ اچھا کھاتے پیتے ہیں۔ ٹیکسی یا کاروں میں گھومتے ہیں اور بڑے رعب سے رہتے ہیں اگر ان سے پوچھا جائے کہ وہ کرتے کیا ہیں تو اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں مل پائے گا۔

دلّی میں بے روزگار کتنے ہیں؟ اس کے لئے روزگار کے دفتر جانے کی ضرورت نہیں۔ بیروزگاری کا مرض اکثر تعلیم یافتہ لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ آجکل حال یہ ہے کہ بے روزگار طبقہ میں ہر پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ ان میں انجینئر۔ اخبار نویس۔ ڈاکٹر۔ ٹیچر۔ سائنسدان۔ اور مختلف پیشوں کے

---

[1] یہ مضمون موجودہ دلّی کی زندگی کے ایک پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔

ماہرین ملیں گے۔ معمولی بی۔ اے۔ ایم۔ اے پاس لوگوں کی تو گنتی ہی نہیں۔

ان بے روزگار لوگوں میں کچھ غیر معمولی ذہانت و فہم کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے مختلف قسم کے پیشے تلاش کر لئے ہیں۔ ان پیشوں میں کوئی برائی نہیں۔ انہیں کوئی سماج دشمن بھی نہیں کہہ سکتا۔ مگر پھر بھی لوگ انہیں عجیب و غریب ضرور کہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ان پیشوں کا انوکھا پن ہے۔ دوسرے پیشوں کی طرح ان پیشوں سے سماجی خدمت ہوتی ہے۔ جس قدر یہ انوکھے ہیں اسی قدر مفید بھی۔ دھیرے دھیرے ان پیشوں کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور وہ وقت بھی دور نہیں جب عوام کو ان پیشوں کے لئے باقاعدہ تعلیم و تربیت کی آسانیاں فراہم کی جائیں گی۔

فی الحال ان نئے رجحانات کا مرکز ایک تاریخی عمارت ہے۔ یہ عمارت قطب مینار کے راستہ میں ہے۔ شاید اسی لئے اس عمارت کا نام کھنڈر کلب پڑ گیا ہے۔ وہ سبھی جوشیلے نوجوان جو پرانے روایتی ڈھرے کو چھوڑ کر کاروبار کے میدان میں نئی نئی ایجادیں کرتے ہیں۔ یا کرنا چاہتے ہیں وہ اس کلب کے ممبر ہیں۔

ان نئے پیشوں کا ذکر کرنے سے پیشتر اس کھنڈر کلب کے بارے میں کچھ کہہ دینا مناسب ہوگا۔ مہرولی روڈ پر چلتے ہوئے جب قطب کی لاٹ سامنے دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور دائیں بائیں سوائے تاریخی عمارتوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا وہاں آپ ذرا دیر کے لئے رک جائیے۔ پاس دائیں طرف آپ کو ایک پگڈنڈی ملے گی۔ اس پر ٹھیک آدھا میل چلنے کے بعد ایک وسیع میدان آئے گا۔ جس کی ہری ہری گھاس دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہاں لوگ کرکٹ کھیلنے آتے ہوں۔ اسی میدان کے کنارے ایک بڑا سا گنبد ہے۔ یہ گنبد ہی کھنڈر کلب کا دفتر ہے۔ اس گنبد کے قرب وجوار میں اور کوئی عمارت نہیں ہے۔ گنبد میں کھانے پینے کی سب چیزیں ملتی ہیں کلب کے ممبران کے لئے عیش و آرام اور تفریح کا سب سامان یہاں مہیا کیا گیا ہے۔ گنبد کے ایک گوشہ میں ایک چھوٹا سا

کتب خانہ بھی ہے اور میز پر بہت سے اخبار و رسائل بھی پڑے رہتے ہیں کلب کا دفتر شام کے آٹھ بجے کھلتا ہے۔ اور صبح آٹھ بجے بند ہوتا ہے۔ ممبران حضرات یہاں غور و فکر اور تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ سب کے مسائل پر گفتگو ہوتی ہے۔ مگر صاحب صدر اپنا فیصلہ دیتا ہے۔ اور طریقہ کار کو متعین کرتا ہے۔ اس طرح جوشیلے نوجوان نئے پیشوں کی الجھنوں کو سلجھاتے ہیں۔

خدا کے فضل سے سبھی ممبران اپنے اپنے پیشوں میں چل نکلے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ پرانے دھندوں میں کچھ نہیں رکھا ہے نئے پیشوں میں جہاں ہاتھ مارو چاندی ہی چاندی ہے۔ سب سے بڑھکر یہ بات ہے کہ ان دھندوں میں کالے اور سفید بازار کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ کنٹرول کے جھگڑے سے بھی یہ آزاد ہیں۔ یہاں سب کچھ سفید ہی سفید ہے۔ کسی کو کبھی جھوٹ نہیں بولنا پڑتا۔ بے ایمانی نہیں کرنی پڑتی اور نہ غریبوں کا خون ہی چوسنا پڑتا۔ ان سبھی پیشوں کا تعلق دولت مند لوگوں سے ہے۔ اس لئے ان کی وجہ سے غریبوں کی کچھ خدمت ہی ہوتی ہے۔ وکیلوں اور ڈاکٹروں کی طرح ان لوگوں نے بھی اپنی فیس مقرر کرلی ہے۔ چونکہ تمام گاہک مالدار ہیں اس لئے فیس بھی معقول لیتے ہیں۔ کھنڈر کلب کے ایک ممبر کی اوسط آمدنی ۳۰ روپیہ سے ۵۰ روپیہ یومیہ کے درمیان ہوتی ہے۔ ہر ممبر کو سو روپیہ ماہانہ کلب کیلئے دینا پڑتا ہے۔ اس طرح کلب کا سرمایہ بڑھتے بڑھتے پچاس ہزار ہو گیا ہے۔

کھنڈر کلب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ اس کے دفتر کی عمارت پر کسی طرح کا تعارفی بورڈ یا ٹھپہ نہیں لگا ہے۔ دن میں ادھر سے بہت سے لوگ گذرتے ہوں گے۔ مگر اس گنبد کی طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی ہے۔ عام آدمی اسے ایک معمولی تاریخی کھنڈر کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے۔

آیئے۔ اب اس انوکھے کلب کے ممبران سے آپ کا تعارف کرائیں۔ اور ان کے عجیب وغریب پیشوں کی کہانی سنائیں۔ کلب کی سرگرمیوں کو کئی شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں شعبہ استقبالیہ سب سے اہم ہے۔ اس شعبہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا کام ہے دلّی میں آنے والے لوگوں کی تواضع و خاطر مدارات کرنا۔ دلّی سے بڑھ کر اہم شہر آج ملک بھر میں کوئی نہیں۔ اس لئے کوئی بھی قابل قدر فرد —— مرد یا عورت۔ ایسا نہیں جو کسی نہ کسی بہانے دلّی کا چکر نہ لگائے۔ یہ لوگ اس بات کی خوب جانچ رکھتے ہیں کہ کون کب آرہا ہے۔ کچھ نووارد دلّی میں سیاسی خواہشات وعزائم لے کر آتے ہیں۔ کچھ کاروبار کی ترقی کے لئے۔ اور کچھ لوگ یونہی شہرت کی تلاش میں ادھر آنکلتے ہیں۔

نووارد اور دلّی میں کیا تعلق ہے ؟ ممبران کو یہ سمجھانے کے لئے کھنڈر کلب میں ایک بہت بڑی تصویر یا کارٹون ٹنگا ہے اس تصویر میں دلّی ایک وسیع جنگل کے روپ میں دکھائی گئی ہے جس میں طرح طرح کے جانور رہتے ہیں۔ اور نووارد کو ایک شکاری کی شکل میں دکھلایا گیا ہے۔ جو امیدوں سے بھرا ہوا ہے اور کاندھے پر بندوق رکھے ہونٹوں سے سیٹی بجاتا جنگل کی طرف آگے بڑھ رہا ہے۔

جن ممبران کو ایسی عمدہ تعلیم وتربیت ملی ہو وہ اپنے کام میں کیسے دھوکا کھا سکتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی دھنی و دولت مند شخص دلّی میں آتا ہے۔ یہ لوگ فوراً ایک منصوبہ بنا کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اگر آنے والا کوئی تاجر ہے۔ تو کاروباری معاملوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر وہ سماجی کارکن ہے تو اس پر سیاسی بلجلوں کے ڈورے ڈالتے ہیں، اس طرح نووارد ایکدم ان کی طرف کھنچا چلا آتا ہے اور اکثر اپنی عقل اور بٹوہ دونوں ان لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ لوگ بھی بہت ایماندار ہیں۔ نووارد کے اعتماد کا بیجا فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں۔

اپنے مشوروں اور اپنے تعارفی حلقوں کے ذریعہ ہی یہ نووارد کی خدمت نہیں کرتے۔ اور بھی کئی مشکل کام کرنے کی ان میں ہمت ہے۔ اگر کوئی شخص نام و شہرت کا بھوکا ہے اور یہ خواہش رکھتا ہے کہ

دلّی میں آتے ہی اس کے بارے میں تمام پڑھے لکھے لوگ واقف ہو جائیں۔ تو اس کا بھی انتظام کر دیا جاتا ہے۔ کھنڈر کلب کے ممبران فوراً کسی نہ کسی طرح ایک تقریب کا انتظام کر دیتے ہیں، جس میں میزبانی کے فرائض مقامی ممتاز شخصیتیں انجام دیتی ہیں اور اس محفل کے مہمان ہوتے ہیں نووارد صاحب۔ بیسیوں ایسے مقامی لوگوں کو بلا لیا جاتا ہے جنھیں بغیر پیسے خرچ کئے اچھا کھانا خوراک برا نہیں معلوم ہوتا۔ ایسی تقریب میں مقامی اخبار نویس بھی آنے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ اس بہانے بہت سے لوگوں سے نووارد کی ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ اور اگلے دن چند مقامی اخباروں میں اس کا نام بھی چھپ جاتا ہے کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس تقریب پر آنے والے تمام اخراجات مہمان محترم کو ہی اٹھانے پڑتے ہیں۔ اس طرح "کھنڈریوں" کی اچھی آمدنی بھی ہو جاتی ہے۔ اور باہر سے آئے مہمانوں کی عزت بھی۔

دلّی میں آنے والے سبھی نام کے بھوکے نہیں ہوتے ہیں بہت سے یہاں صرف ضروری کام سے آتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی بڑی مصروف ہوتی ہے۔ کام نکالنے کے لئے کس سے ملنا ہے۔ کب ملا جائے کیسے ملا جائے۔ ان سب جھنجھٹوں کے لئے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا ہے۔ انھیں بھی کھنڈریوں کا آسرا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ جو تمام کام فوراً کرا دیتے ہیں۔

کھنڈر کلب کا ایک اور شعبہ ہے۔ جس میں ایسے ماہرین کام کرتے ہیں جو صرف بگڑے ہوئے کام بناتے ہیں۔ کسی ملازم سے کوئی افسر ناراض ہو گیا ہو۔ یا کسی وجہ سے کسی کو نوکری سے جواب مل رہا ہو۔ یا کافی کوشش کے باوجود بھی کسی کی خواہش پوری نہیں ہو رہی ہو ایسی بیماریوں کا علاج بھی کھنڈر حکیموں کے پاس ہے ان لوگوں کا سب سے بڑا سہارا محض عقل و دماغ ہیں۔ غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے ہی ان کو بڑی دور کی سوجھتی ہے۔ صاحب معاملہ فکر و پریشانی کی وجہ سے اپنی عقل سے ٹھیک ٹھیک کام نہیں لے سکتا۔ کھنڈر بھائی قطعی بے تعلق ہیں۔ انہیں کسی شے یا فرد سے کوئی لگاؤ نہیں۔ اس لئے فطری طور پر ان کی عقل کبھی خطا نہیں کھاتی۔ ڈوبتے آدمی کو

پھر سے سطح پر لانے کا یہ کوئی نہ کوئی راستہ کھوج ہی نکالتے ہیں۔

کچھ دن ہوئے مجھے ان لوگوں کی ہوشیاری کی ایک بہت ہی خوبصورت مثال ملی۔ دلّی کے ایک کارخانہ میں ایک اکاؤنٹنٹ صاحب تھے۔ جنکو تقریباً پانچ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ کارخانہ کے مالک کسی وجہ سے ان سے ناراض ہو گئے اور انھوں نے اسے نوکری سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سن کر اکاؤنٹنٹ بیچارہ کانپ اٹھا۔ ان کی گرہستی بہت کچّی تھی۔ چھ بچّوں کا باپ ٹھہرا۔ اس کے معاملہ کا آخری فیصلہ اب مینیجنگ ڈائرکٹر کو کرنا تھا۔ غریب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے۔ خوش قسمتی سے ایک دن اس کی ملاقات کھنڈر کلب کے ایک ممبر سے ہو گئی۔ جس سے اس نے تمام کہانی کہہ سنائی۔ کھنڈری نے کہا! ”واہ یار! یہ بھی کوئی بات ہے۔ اس کا انتظام تو ہم کر دیں گے۔ مینیجنگ ڈائرکٹر کی کیا مجال ہے جو آپ کو ہٹا سکے؟“

اکاؤنٹنٹ کا معاملہ کھنڈر کلب نے اپنے ہاتھ میں لے لیا مینیجنگ ڈائرکٹر کو متاثر کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں۔ وہ ان دنوں بیمار تھے۔ اور اکثر بستر ہی پر لیٹے رہتے تھے۔ جب اکاؤنٹنٹ کے معاملہ کا فیصلہ ہونے میں صرف دو دن رہ گئے۔ کھنڈر کلب کے صدر نے ایک تجویز پیش کی۔ ایک ممبر کو اپنے قریب بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ اگلے دن سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ ممبر پرانی دلّی آگیا۔ چاندنی چوک سے اس نے ایک بوڑھے جیوتشی کو پکڑا پانچ روپیہ جوتشی کے ہاتھ پہ رکھ کر اسے سمجھانا شروع کیا۔ جیوتشی سیدھا مینیجنگ ڈائرکٹر کے گھر پہونچا۔ گھر کی خواتین نے اسے فقیر جان کر اسے آٹا دینا چاہا۔ اس نے کہا: ”ماتا! میں بھکاری نہیں ہوں۔ میں تو یہاں کا مشہور جیوتشی ہوں۔ مستقبل کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو۔ کسی بیمار یا ناکام آدمی کے لئے کچھ کرانا ہو تو کہیئے۔ نہیں تو برہمن اپنا راستہ لیتا ہے۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے۔“

جیوتشی سڑک کی طرف مڑا ہی تھا کہ ایکدم پیچھے سے آکر ایک لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لڑکا بولا: "بابا چلئے! میرے تاؤ جی بیمار پڑے ہیں۔ ان کا ہاتھ دیکھئے" عزت و احترام کے ساتھ جیوتشی کو اس کمرہ میں لایا گیا جہاں منیجنگ ڈائرکٹر بیمار پڑے تھے۔ گھر کی عورتوں کے اصرار پر انہوں نے جیوتشی کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔

آدھ گھنٹہ تک جیوتشی مہاراج ہاتھ دیکھتے رہے۔ اور طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ بہت غور و فکر کے بعد سنجیدہ آواز میں بولے: "بھگوان آپ کو لمبی عمر دے۔ آپ کے ستارے تو بہت برے نہیں۔ مگر شنی کی صورت حال ذرا پریشان کن ہے۔ اسی وجہ سے جسم کو تکلیف اٹھانی پڑی ہے" بات چیت میں دلچسپی لیتے ہوئے ڈائرکٹر صاحب بولے:۔

"مہاراج گرہ کی بات تو ٹھیک ہے۔ یہ تو بتائیے یہ مصیبت کا وقت کب تک چلے گا۔ اس کو دور کرنے کا کوئی طریقہ بتلائیے"

جیوتشی نے کہا: "شنی کی حالت کا تعلق عام طور پر انسان کے عمل سے ہوتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ ایک دو نیک کام کرنے سے ہی ایک ماہ میں یہ مصیبت ٹل سکتی ہے۔ بھگوان نے چاہا تو آپ بالکل صحت مند ہو جائیں گے، اگر آپ چاہیں تو پوجا میں اپنے گھر پر کر سکتا ہوں۔ یا آپ کہیں تو یہیں پر شروع کر دوں۔ مگر ایک کام آپ کو ہر روز کرنا ہوگا۔ صبح ہی صبح جمنا جی جانا ہوگا اور وہاں اشنان کرنا ہوگا"

منیجنگ ڈائرکٹر بولے: "یہ جان کر تو خوشی ہوئی کہ یہ حالت زیادہ عرصہ رہنے والی نہیں۔ مگر میں پابندی سے روزانہ جمنا جا سکوں گا اس کے بارے میں مجھے شبہ ہے۔ اگر کوئی زیادہ آسان طریقہ ہو سکے تو بتائیے۔ ورنہ یہی کروں گا"

پانچ منٹ تک جیوتشی اپنا پتر دیکھتے رہے اور ڈائرکٹر صاحب کے ہاتھوں کی لکیروں کو اپنے ناخن سے کریدتے رہے۔ جیسے کوئی بھولی بات اچانک یاد آ گئی ہو۔ ایکدم چونکتا ہو کر وہ بولے:۔

"ہاں! ایک طریقہ یاد آیا۔ بڑا ہی آسان ہے۔ پر کہہ نہیں سکتا کہ وہ ہو سکے گا یا نہیں اسکے لئے

خاص حالات درکار ہیں اگر آپ کسی کو ایسی معافی دے سکیں جسے وہ آدمی نئی زندگی ملنے سے کم نہ سمجھے یا اپنی زندگی کے برابر ہی سمجھے تو ہفتہ بھر میں ہی اس تکلیف سے نجات مل سکتی ہے۔"

مینیجنگ ڈائرکٹر نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا:- "اچھا پنڈت جی! آپ اپنے گھر پر پوجا پاٹ کا انتظام کریں۔ روزانہ جمنا جی نہانے نہیں جا سکوں گا۔ دوسرا طریقہ جو آپ نے بتلایا ہے وہ میں ضرور کر دوں گا۔"

جیوتشی جی کھڑے ہو گئے۔ بھیک اور پوجا پاٹ کے پیسے لے اور سب کو آشیرواد دے واپس آ گئے۔

چار دن بعد ہی اکاؤنٹنٹ کھنڈر کلب پہونچا۔ گنبد میں داخل ہوتے ہی اس نے صدر محترم کو ایک سو دس روپیہ پیش کئے۔ (سو روپیہ فیس اور دس روپیہ مٹھائی کے لئے) اس کا کام بن گیا تھا۔ اور کارخانہ کے مینیجنگ ڈائرکٹر نے معمولی سی تنبیہہ کر کے اس کے حق میں فیصلہ دیدیا تھا۔

اسی طرح کے بہت سے کام کرنے کا فخر کھنڈر کلب کو حاصل ہے۔ کسی کا نقصان کئے بغیر اپنے گاہکوں کا فائدہ کرنے میں یہ لوگ بہت ماہر ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے آج تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کے غیر مناسب ہونے میں کسی کو ذرا بھی شک ہو سکے۔ ان لوگوں کے من میں میل نہیں اور دلوں پر بوجھ نہیں۔ ان کی خدمات کی سبھی کو ضرورت پڑتی ہے۔ اگر کسی ان پڑھ گواہ کی موجودگی سے کچہری کے سکون کا منتشر ہونے کا ڈر ہو ایسے موقعوں پر بھی کھنڈر بھائی ہی کام آتے ہیں۔ یہ لوگ جسے چاہیں روک لیں۔ جسمانی طاقت کے سہارے نہیں۔ بلکہ بھائی چارہ محبت و دوستی سے۔

آجکل کھنڈر کلب کا سب سے بڑا محکمہ وہ ہے جس کا نام الیکشن محکمہ ہے۔ اس محکمہ میں تقریباً سو آدمی کام کرتے ہیں سب کو سخت ٹریننگ دی جاتی ہے۔ سب کو نظام جمہوریت میں الیکشن کی اہمیت۔ الیکشن کے اصول۔ قواعد وضوابط اور مختلف داؤ پیچ کے بارے میں پوری پوری تعلیم دی جاتی ہے۔ اکتوبر کے مہینہ میں دلّی میں جو میونسپل چناؤ ہوئے تھے اس زمانہ میں ان لوگوں نے ان اصولوں کو خوب پرکھا۔ کھنڈر

کلب نے چار کیس اپنے ہاتھ میں لئے تھے۔ اور وہ چاروں چناؤ کے دنگل میں کامیاب رہے۔ ان میں سے تین امیدوار ایسے تھے جنھیں قابل قدر اور مقبول شہری کہا جاتا ہے اور ان کے پاس کافی دولت تھی۔ انھیں تو ہر حالت میں کامیاب ہونا ہی تھا۔ کھنڈر کلب کو ان کی کامیابی کا بہت زیادہ ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مگر چوتھے امیدوار کا کیس بڑا پر لطف ہے۔

یہ حضرت دلّی کے ایک ایسے وارڈ سے کھڑے ہوئے تھے جس کی آبادی گھنی ہے۔ یہ آزاد امیدوار تھے۔ دلّی میں رہتے انھیں پانچ سال ہو چکے تھے۔ اپنے وارڈ میں ان کا تعارف بہت کم لوگوں سے تھا۔ پیسے کی اسقدر تنگی تھی کہ انہوں نے سرکاری قرضوں کے لئے حکومت کے ہر محکمہ میں درخواست دے رکھی تھی پھر بھی نہ معلوم کیا سوچ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ ان کا نام تو مجھے یاد نہیں۔ اتنا ہی معلوم ہے کہ لوگ ان کو دیوان صاحب کہا کرتے تھے۔ دس دن تک چناؤ کا ہنگامہ رہا۔ ان کے پاس جسقدر پیسہ تھا وہ سب لاؤڈ اسپیکر اور تانگہ و رکشا کے کرایہ پر خرچ ہو گیا۔ دیوان صاحب بڑے چکر میں تھے کہ اب کیا کریں۔ انہیں کھنڈر کلب کی یاد آئی۔ اسی دن انہوں نے کلب کے صدر کے سامنے جا کر اپنا مسئلہ پیش کیا۔ صدر نے کہا: "کوئی پرواہ نہیں۔ آپ سے ہم لوگ پیشگی پیسہ نہیں مانگتے ہیں۔ اپنے ذرائع و کوششوں پر ہمیں اسقدر یقین ہے کہ ہمیں آپ کی کامیابی پر ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔ آپکے چنے جانے کے بعد فیس لے لی جائے گی۔"

دیوان صاحب نے ہاں کر لی۔ اور کھنڈر کلب کی نگرانی میں الیکشن کا کام زور شور سے چلنے لگا۔ کرایہ پر آدمی جمع کرنے کے لئے ان کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ اس لئے مختلف طریقوں سے آدمی اکٹھے کئے جاتے تھے۔ جہاں سو آدمیوں کی بھیڑ جمع ہوئی انہوں نے دیوان صاحب کے پروپیگنڈہ کا کام شروع کر دیا۔ کبھی تو یہ لوگ ایسا کرتے کہ آپس میں ہی سائیکلیں ٹکرا لیتے۔ اور سڑک کے بیچ کھڑے ہو کر لڑنے لگتے۔ خود بخود سو پچاس آدمی جمع ہوتے دیر نہ لگتی مجمع کو دیکھ یہ فوراً ہی ایک دوسرے سے

ہاتھ ملا لیتے اور ایک ساتھ چلا کر کہتے۔ "ووٹ کا حقدار کون؟ دیوان صاحب"۔

پانچ دن تک انھوں نے اسی طرح بہت اچھا پروپیگنڈا کیا۔ اب الیکشن میں دو دن رہ گئے تھے۔ اس علاقہ سے دو بہت بڑے آدمی امیدوار تھے۔ ان کی پشت پناہی بڑی بڑی سیاسی پارٹیاں کر رہی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دیوان صاحب کی ضمانت ضبط ہو جائے گی۔ در اصل ہوتا بھی ایسا ہی۔ اگر ایک کھنڈری کو بے پر کی نہ سوجھی ہوتی۔

اس وارڈ کے ٹھیک درمیان ایک پارک ہے۔ جہاں لوگ صبح و شام ٹہلنے نکلتے ہیں۔ آٹھ بجے تک لوگ گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں، اور پارک سنسان ہو جاتا۔ ۱۳ اکتوبر کی رات کو محلہ کے لوگوں نے ایک قیامت کا شور سنا۔ اور سب لوگ پارک میں جمع ہو گئے دیکھتے کیا ہیں ہری گھاس پر دیوان صاحب پڑے ہیں، ان کے سر سے خون نکل رہا ہے۔ اور ایک آدمی پٹی باندھ رہا ہے۔ اور دو آدمی رومال سے ہوا کر رہے ہیں۔ پاس ہی ایک بڑھیا کھڑی رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ چیزیں تھیں۔ انہیں لوگ جھک جھک کر دیکھ رہے تھے۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی:۔ "او بیٹا میری عمر تجھے لگ جائے۔ میری مدد کے لئے اگر تو نہ بھاگا ہوتا تو چوروں نے مجھے مار ہی دیا ہوتا۔ میرے سب زیورات چھین لئے ہوتے بالیوں کے لالچ میں ظالموں نے میرے دونوں کان زخمی کر دیئے ہیں۔ مجھے زیورات کی اب فکر نہیں مجھے تو اب تیری فکر ہے۔ تو اصل مائی کا لال ہے۔ جو میری چیخ و پکار سن کر اکیلا بغیر کسی ہتھیار کے باغ میں کودا۔ ظالموں نے تجھے بھی کم نہیں مارا۔ اگر تجھے کچھ ہو گیا تو میں اس گناہ کو کیسے اپنے سر پر اٹھاؤنگی"۔

باغ میں ایسی کچھ وارداتیں پہلے بھی ہو چکی تھیں۔ مگر کسی نے اس سے پہلے بہادری کا ایسا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ بدقسمتی سے غنڈے بھاگ نکلے تھے۔ وہ جاتے جاتے دیوان صاحب کو زخمی کر گئے تھے سارے وارڈ میں شور مچ گیا۔ ایک دم پولیس بلالی گئی۔ فوراً دیوان صاحب ہسپتال لے جائے گئے۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کے بعد کھڑے ہزاروں کے مجمع کو کہا کہ دیوان صاحب خطرہ سے باہر ہیں۔ اگرچہ ان کے

سر میں کافی چوٹ آئی ہے۔
اس رات کو گیارہ بجے تک وارڈ میں سناٹا رہا۔ الیکشن سے متعلق تمام جلسے ملتوی کر دیئے گئے۔ سبھی جگہ لوگ دیوان صاحب کی بہادری کی تعریف کر رہے تھے۔
اگلا دن ہوا۔ ۱۴ را کتوبر کو دیوان صاحب کے گھر سے پروپیگنڈے کے لئے صرف چار آدمی نکلے جیسے ہی انہوں نے کہا:
"تمہارے ووٹ کا حقدار کون؟" محلہ کے سیکڑوں آدمی چلّا اٹھے:۔ "دیوان صاحب"۔ آن کی آن میں ہزاروں لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ یہ بھیڑ عام محلوں میں گھومی۔ کسی کو تقریر کرنے کی ضرورت نہیں پڑی بھیڑ ذرا سہمی سی دکھائی دے رہی تھی، جیسے یہ لوگ شمشان گھاٹ کی طرف جا رہے ہوں۔ کبھی کبھی کوئی نوجوان چلّا اٹھتا:۔ "اس وارڈ کا سردار کون ہے؟" لوگ کہتے "دیوان صاحب"۔
"ہماری سچی بھلائی چاہنے والا کون ہے؟"
بھیڑ کہتی:۔ "دیوان صاحب"۔
۱۵ را کتوبر کو ووٹنگ شروع ہوئی۔ کسی بھی ووٹر کو پارٹی بندی کا خیال نہ رہا۔ زیادہ تر لوگوں کو ایک ہی بات یاد رہی کہ محلہ کے سچے سردار دیوان صاحب ہیں۔
اگلے دن ووٹنگ کا نتیجہ نکلا۔ باقی سب امیدواروں کو ملا کر جتنے ووٹ تھے۔ اکیلے دیوان صاحب کے اس سے بھی زیادہ تھے۔
ایسا معجزہ کھنڈر کلب کے ممبران ہی کر سکتے تھے۔ دلّی میں جتنی تعجب خیز اور ناممکن باتیں ہوتی ہیں ان میں سے تین چوتھائی کھنڈر کلب کے کھاتے میں ڈالی جا سکتی ہیں۔ ان لوگوں کی سرگرمیوں سے راجدھانی کا ذہنی اور معاشی معیارِ زندگی بلند ہوا ہے۔ کھنڈر کلب کے طفیل ڈیڑھ دو ہزار تعلیم یافتہ آدمی کام سے لگے ہیں اور خدا کے فضل سے اچھی کمائی کر رہے ہیں۔

(۳۰)

قافلہ کا کوچ

مہینہ بھر سے لاکھوں کی تعداد میں ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کے آنے اور کچھ مسلمانوں کے پاکستان جانے کی خبریں آرہی تھیں۔ اگرچہ یہ خبریں اخباروں اور سرکاری اشتہاروں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں پھر بھی حالات کی سنجیدگی اور حقیقت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے کم از کم ایک دو چلتے پھرتے قافلوں کو دیکھنا بہت ضروری تھا۔ اسی لئے ایک قافلہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھ رہا ہوں۔

یہ موقع مجھے ۲۶ را کتوبر ۱۹۴۷ء کو ملا۔ وزیر صاحب کو دس بجے رہتک پہونچنا تھا اور وہاں سے ۱۹ میل دور مہم نامی مقام کے قریب ایک بہت بڑے قافلہ کا معائنہ کرنا تھا۔ یہاں ۵۶ ہزار مسلمان حصار کے راستہ پاکستان جانے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ صبح چھ بجے چلکر ہم لوگ موٹر سے ۹ بجے رہتک جا پہونچے۔ راستہ میں وزیر محترم ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد راستہ میں آنے والے گاؤں اور جگہوں کے نام پوچھتے رہے۔ ایک جگہ بہت سے مندروں کی بُرجیاں دکھائی دیں۔ اس بیابان میں جہاں ریت، ٹمینٹ اور سینگر کی کانٹے دار جھاڑیوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مندروں کو دیکھکر

وزیر صاحب کا تجسس جاگ اٹھا۔ ان کے پوچھنے پر میں نے بتایا یہ ستھل بوہر کا مٹھ ہے۔ اسے دیکھ کر وزیر محترم کے دل میں مشرقی بنگال کے مٹھوں کی یاد تازہ ہو گئی۔

ہماری گاڑی بہت تیز جا رہی تھی۔ اور ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ اس لئے حکم ہوا کہ دس منٹ وہیں رک جائیں۔ اپنے فرض کو پورا کرنے کے لئے میں نے وزیر موصوف کو ستھل بوہر کے مٹھ کی تاریخ اور وہاں کے سادھوؤں کی روایات کے بارے میں کچھ بتایا۔ جس سے وہ کافی خوش ہوئے۔ اس طرح دس منٹ سڑک پر ٹھہرنے کے بعد ہماری گاڑی آگے بڑھی۔

ٹھیک نو بجے ہم لوگ کلکٹر کے مکان پر جا پہونچے۔ کچھ کھانے پینے کے بعد فوراً ہی مہم قافلہ کے بارے میں گفتگو شروع ہو گئی۔ کلکٹر صاحب اور وزیر صاحب ایک گھنٹہ تک بڑی سنجیدگی سے گفتگو کرتے رہے۔ میرا کام صرف ان کی گفتگو سننا تھا۔ اس گفتگو کے درمیان میں خاموش رہا۔

دس بجے ہی ضلع کے دوسرے بڑے افسران وہاں آ پہونچے۔ پروگرام کے مطابق ہم سب لوگ ساڑھے دس بجے مہم کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہم لوگ رہتک کے بازاروں کے بیچ سے جا رہے تھے۔ بچپن سے ہی میں رہتک سے واقف ہوں۔ کیوں کہ یہاں میری ننہال ہے۔ لیکن اس بار میرے حافظہ نے دھوکا کھایا۔ بند دکانیں۔ سونی سڑکیں اور ویران بازار عجیب دکھائی دیتے تھے۔ اس میں اور پرانے رہتک میں مجھے کوئی میل دکھائی نہیں دیا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ کبھی کبھی مجھے شک ہونے لگتا کیا واقعی ہم رہتک کے درمیان ہی سے گزر رہے ہیں۔ پھر ایک دم وہ منڈی آئی جہاں سے مہم کیلئے سڑک مڑتی ہے اس منڈی کو میں نے پہچان لیا۔ اور تب میرا شک ختم ہوا۔ بازار میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور بھٹکتے دو چار کتوں یا گائیوں کے علاوہ ہمیں کچھ نظر نہیں آیا۔ شہر میں ۲۴ گھنٹہ کا کرفیو لگا تھا۔ کچھ لوگ گھروں کی کھڑکیوں سے ہماری کاروں کو دیکھ رہے تھے۔ شہر کی سرحد سے باہر نکلتے ہی ماضی اور حال کا فرق اور بھی زیادہ وسیع ہو گیا۔ لیک کے مانند دکھائی دینے والی لمبی سڑک ریتیلے میدان میں اُگے

جھاڑ جھنکاڑ۔ اِدھر اُدھر دکھائی دینے والے مٹی کے گھروندے۔ انہوں نے فضا کو ہی نہیں۔ بلکہ اس فضا میں سانس لینے والے ہم سب کو بہت متاثر کیا۔ ہم بات چیت برابر کر رہے تھے۔ مگر بولنے والوں کی آواز دھیمی تھی۔ اور سننے والے سنجیدہ تھے۔ سبھی لوگ فکر میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی اور فکر تھی۔ اس سارے علاقہ میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ سڑک سے دکھائی دینے والے سب دروازے بند تھے۔ دور کھیتوں میں کہیں کہیں گائے۔ بیل بکری وغیرہ چرتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک دو جگہ کھلیان اور چارے کے ڈھیر نظر آئے۔ مگر حضرت انسان کے دیدار کہیں بھی نہ ہوئے۔

اچانک سڑک کے بائیں طرف ہمیں کچھ پکے مکانات دکھائی دیئے۔ پتہ لگا یہ کلانور ہے جس قصبہ میں مسلمانوں کی کافی آبادی تھی۔ گاؤں کے قریب پہونچتے ہی سب سے آگے چلنے والی فوجی گاڑی ایک دم رک گئی۔ دوسری کاریں بھی وہاں ٹھہر گئیں۔ وزیر صاحب اور کلکٹر کار سے نیچے اترے اور ان کے ساتھ ہی اس پارٹی کے دوسرے ممبران سڑک سے نیچے آکر کھڑے ہو گئے۔ کلکٹر نے بتلایا کلانور مسلمان راجپوتوں کا گڑھ تھا۔ گاؤں کی روایت تھی کہ یہاں کے زیادہ تر لوگ فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔ ابھی بھی گاؤں کے پانچسو سے زیادہ لوگ فوج میں بھرتی ہیں۔ گاؤں کے کھیتوں اور گھروں کو دیکھنے سے صاف پتہ لگتا تھا کہ کلانور کے باشندے دوسرے گاؤں والوں کی نسبت زیادہ خوش حال ہیں۔ ہم کے قافلوں میں جو لوگ شامل تھے۔ ان میں کلانور کے باشندوں کا خاص مقام تھا، تنہا اس گاؤں سے قافلہ میں دو ہزار عورت مرد شامل تھے۔

وزیر محترم کو اس گاؤں کو دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ کلکٹر کے ساتھ سڑک کے کنارے والی ہی ایک گلی کی طرف مڑ گئے۔ ہم سب لوگ ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ سب کی آنکھیں ادھر ادھر لگی تھیں۔ پر زبان کسی نے نہیں کھولی۔ گلی ایکدم ویران تھی۔ کچھ گھروں کے دروازے بند تھے۔ مگر زیادہ تر گھر کھلے

پڑے تھے۔ جنہیں دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ کہ ان کے مکین اپنا بستر بوریا اٹھا کر رخصت ہو چکے ہیں۔ گلی کے آخر تک سب لوگ گئے۔ اور پھر وزیر موصوف اور کلکٹر کے ساتھ ہی واپس آ گئے۔

واپسی کے وقت وزیر صاحب کی توجہ ایک اصطبل کی طرف گئی۔ جس کے بڑے بڑے کواڑ کھلے پڑے تھے۔ پل بھر کے لئے سب لوگ یہاں رکے اندر کچھ بجھا اور کچھ بغیر بجھا کوئلہ پڑا تھا۔ ایک کونے میں ایک نہائی۔ کچھ ہتوڑے کے دستے پڑے تھے۔ فرش پر ادھر ادھر ٹوٹے پھوٹے لوہے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ یہ ایک لوہار کی دکان تھی۔ سب چیزوں کو دور سے دیکھا۔ بنا ایک لفظ بولے ہم سب لوگ سڑک کی طرف بڑھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم میں سے کچھ لوگوں کی بولنے کی خواہش تھی مگر ماحول کا تقاضہ تھا کہ خاموش ہی رہا جائے۔ سب کے دلوں میں مختلف طرح کے خیالات کا سیلاب آ رہا تھا۔ مگر زبان کا دروازہ بند تھا۔ ایسی گہری خاموشی شمشان کے علاوہ اور کہیں کم ملے گی۔

سڑک پر آنے ہی سب اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ گئے۔ مہم یہاں سے چار میل تھا۔ تھوڑی دور چل کر ہمیں قافلے دکھائی دینے لگے۔ کاروں کی رفتار کم ہوئی۔ قافلہ کا فوجی دستہ وزیر محترم کے استقبال کے لئے سڑک پر آ کھڑا ہوا۔

قافلہ کا کوچ

مہم رہتک ضلع میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جہاں کچی پکی کئی سڑکیں آ کر ملتی ہیں۔ اس لئے یہی آسان سمجھا گیا کہ دیہات کے وہ سب لوگ جو پاکستان جانے کے لئے خواہشمند تھے وہاں آ کر اکٹھے ہو جائیں۔ ۲۰ اکتوبر کی شام تک پچاس ہزار لوگ آ چکے تھے۔ مہاجروں کے سفر اور ان کی آسانیوں کے لئے بھارت سرکار نے پورے انتظامات کر رکھے تھے۔ کیمپ کے پاس پہونچتے ہی گاڑیاں رکیں اور سب لوگ

نیچے اتر گئے۔ وزیر محترم اور کلکٹر ایک طرف ہو گئے۔ اور آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ پارٹی کے دوسرے حضرات وہیں کھڑے چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہی وزیر موصوف ہم سے آملے۔ کلکٹر نے قافلہ کے باڈی گارڈ فوجی افسروں اور قافلہ کے سردار سے وزیر کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کلکٹر صاحب سے کھانے پینے کی آسانیوں کے بارے میں معلومات کیں۔ پھر وزیر موصوف نے قافلہ کے سردار سے بات چیت کی۔ جو کلانور کا رہنے والا اور رہتک مسلم لیگ کا خصوصی کارکن تھا۔ سردار نے مقامی افسروں کی کارگزاری اور انتظام پر مکمل اطمینان کا اظہار کیا۔ اور فوجی کپتان کی بڑی تعریف کی۔ یہ کپتان گڑھوالی تھا۔ اس کے دستہ کا کام مہاجروں کی حفاظت کرنا اور ان کو صحیح سلامت ہندوستانی سرحد سے باہر پہونچا دینا تھا۔ یہ سب سن کر وزیر بہت خوش ہوئے۔ اور ان کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ دکھائی دی۔ غالباً اس دن کی یہ پہلی مسکراہٹ تھی۔

کلکٹر اور قافلہ کے سردار کے ساتھ اب وزیر نے کیمپ کا دورہ کیا ہم لوگ بھی پیچھے پیچھے ہو لئے۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ اور قافلہ کو ایک بجے کوچ کا حکم تھا۔ اس لئے کلکٹر تیزی سے چل رہا تھا۔ اور برابر اپنی گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمارے آگے اور پیچھے بندوقوں سے مسلح فوجی سپاہی تھے۔

مہم کا کیمپ وسعت میں بہت بڑا تھا۔ وہ آٹھ میل مربع میں پھیلا ہوا تھا۔ رہتک کے دیہاتوں سے سب لوگوں کو یہاں بلانے میں تین ہفتہ لگے تھے۔ جن قصبوں کے لوگ یہاں جمع تھے ان میں خاص طور پر جھجر۔ گوہانہ - ہانسی کلانور وغیرہ تھے۔ زیادہ تر لوگوں کو آئے ہوئے یہاں تین دن ہوئے تھے۔ ہمیں پتہ لگا کہ ان تین دنوں میں کیمپ میں چھ بچے پیدا ہوئے۔ خوش قسمتی سے طبی امداد کا انتظام قابل اطمینان تھا۔ اور سبھی نوزائیدہ اور ان کی مائیں بخیریت تھیں۔ یہ سن کر وزیر موصوف کلکٹر سے کچھ پوچھنے ہی جا رہے تھے کہ قافلہ کے سردار نے فوجی دستہ کی پھر تعریف شروع کر دی۔ اس نے بتایا

فوجیوں کی مدد سے ز ّچاؤں کے سفر کا اچھا انتظام کر لیا گیا ہے۔ اور انہیں راستہ میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وزیر نے گڑھوالی فوجی افسر کی پیٹھ ٹھونکی۔ اور اسے مبارکباد دی۔

ہم لوگ آگے بڑھتے گئے۔ بہت سے مہاجروں کے پاس اپنا اپنا راشن تھا۔ پھر بھی حکومت ہند کی طرف سے مزید آٹے۔ بھنے چنے اور گڑ کا انتظام تھا۔ قافلہ میں سینکڑوں گائیں۔ گدھے۔ خچر۔ بھینسیں۔ گھوڑے تک شامل تھے۔ جو ادھر اُدھر چر رہے تھے۔ جانوروں کی پشت پر سامان لدا ہوا تھا۔ اگرچہ کیمپ میں ہر عمر کے بہت سے بچے تھے۔ پھر بھی چاروں طرف خاموشی تھی۔ جہاں جہاں وزیر موصوف پہونچتے۔ عورت مرد کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے۔ مگر بولے ان میں سے صرف دو چار ہی۔ وزیر لوگوں سے صرف یہی پوچھتے تھے کہ انہیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ یا کیا وہ سفر کے انتظام سے مطمئن ہیں۔ اکثر سبھی سوالوں کا جواب قافلہ کی طرف سے قافلہ کا سردار ہی دیتا تھا۔

چلتے چلتے ہم لوگ عورتوں اور بچوں کے ایک مجمع کے پاس جا پہونچے۔ وزیر موصوف انہیں ایک طرف چھوڑ دور سے ہی مڑ جانا چاہتے تھے پر بھینسے پر سوار ایک بڑھیا نے انہیں یوں چپ چاپ نہ جانے دیا۔ ہم سب کو دیکھتے ہی وہ بھینسے سے نیچے کو د پڑی چلا چلا کر کچھ کہنے لگی۔ کئی بار جھک کر سلام کرنے کے بعد اس نے رہتک کی دیہاتی بولی میں یوں کہنا شروع کیا۔" صاحب آپ لوگ کہتے ہیں کہ آپ سبھی کے دوست ہیں۔ میرے بھتیجے شفیع نے مجھے پچھلے ماہ بتلایا تھا ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا بھید بھاؤ نہیں ہے۔ تب پھر ہمیں کیوں یہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر ہمیں یہاں سے چلے جانے کے لئے کیوں کہا جا رہا ہے؟"

بچوں کی طرح چیختے چیختے بڑھیا کہتی گئی :" میرے بیٹوں کی کلانور میں چار سو بیگھہ زمین ہے اور دو پکے مکان ہیں۔ ہمیں انہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہئے۔ ہم پرامن کسان ہیں۔ ہم گاندھی بابا اور جناح دونوں ہی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔ اگر دونوں آپس میں جھگڑتے ہیں اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟

ہم اپنے گھر بار کو کیوں چھوڑیں۔ ہمیں اپنی زمین سے لگاؤ ہے۔ ہمیں اپنی زمین سے محبت ہے۔ ہم کبھی کبھی ....."

بڑھیا اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ اس کو صبر و دلاسہ دیتے ہوئے قافلہ کے سردار نے اسے خاموش کر دیا۔ ہماری طرف دیکھ کر اس نے کہا یہ عورت پگلی ہے۔ جذباتیت کے ایسے نظاروں کو سمجھنے کا ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ اگرچہ اس کی اہمیت کو سب ہی سمجھتے تھے۔ آگے بڑھ کر کیمپ میں ہم نے بہت سی عورتوں کو اسی طرح بولتے سنا۔ اب کچھ بچوں کا شور بھی سنائی دیا۔ عورتیں اور بچے ایک ساتھ کچھ بول رہے تھے۔ اس لئے صاف صاف سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔

وزیر محترم اور ان کے ساتھی کیمپ میں برابر گھومتے رہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ہم سب کے قدم بوجھل ہیں۔ چلنے کی تکان ہی اس کا سبب نہیں تھا۔ ممکن ہے پاؤں آگے نہ بڑھنے کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ ہمارے پروگرام میں رسمیت اور تکلف کم تھے۔ اس وقت بحث۔ دلیل اور شور سبھی بے معنی جان پڑتے تھے کیونکہ کچھ ہی لمحوں میں قافلہ کا کوچ ایک کھلی حقیقت تھی۔ ایک سچائی تھی۔ ایسی سچائی جو قانون فطرت کی طرح اٹل ہو۔ اس لئے بات چیت کرنے کی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔

کیمپ کا دورہ ختم کرتے ہی ہم لوگ سڑک پر آ گئے۔ ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ کلکٹر اپنے معاونین کے ساتھ آخری انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ وزیر موصوف ریت کے ایک ٹیلے پر ایک طرف کھڑے تھے۔ اشارے سے انہوں نے مجھے بلایا۔ اور پوچھا اس پورے طوفان کے بارے میں میرا کیا خیال ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ہریانہ میری جائے پیدائش ہے۔ اپنے دورہ کے وقت انھوں نے مجھے ایک مہاجر سے بنگرو زبان میں بات کرتے سنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں کیمپ کو دیکھ کر کچھ بےچین سا ہو اٹھا ہوں۔

میں نے عرض کیا اس سانحہ کا اب سوچ و فکر سے زیادہ تعلق نہیں۔ میں نے مزید کہا رہتک کے مسلمان جاٹ اور راجپوت۔ ہندو جاٹوں کے ہمیشہ قریب رہے ہیں۔ اور ان میں سدا

محبت و پیار اور یکجہتی کے جذبات رہے ہیں۔ مدتوں سے یونینسٹ پارٹی (UNIONIST PARTY) ان دونوں کا مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم رہی ہے دونوں کے سیاسی رہنما بھی ایک ہی رہے ہیں۔ میرے خیال میں ابھی بھی ہندو اور مسلمان کسانوں میں کسی طرح کا امتیاز نہیں اور ان کے باہمی تعلقات بہت اچھے ہیں۔ یہ کہہ چکنے کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ وزیر محترم کچھ سوچتے رہ گئے۔ میں حیران تھا اب اور کیا کہوں۔ بہت سے خیالات میرے دل میں پیدا ہوئے اور دماغ سے ٹکرا کر رہ گئے۔ اگر میں نے کچھ خیالات کا اظہار بھی کرنا چاہا تو مجھے مناسب لفظ نہیں مل پا رہے تھے۔ میں بہت بےچین تھا۔ اسی وقت فوج کا بگل بج اٹھا۔ اس موضوع کی تبدیلی کا میں نے خیر مقدم کیا۔ وزیر موصوف وہیں گم سم کھڑے کیمپ کی طرف دیکھنے لگے۔

بگل کی آواز سنتے ہی کیمپ کے سبھی لوگ کھڑے ہو گئے۔ والدین نے بچوں کو گننا شروع کیا۔ اور اپنے اپنے سامان کو سنبھالا۔ چند منٹوں میں ہی میلوں میں پھیلے عورت مرد میدان کو چھوڑ سڑک کی طرف بڑھے۔ دھیرے دھیرے سب لوگ اپنے مویشیوں سمیت سڑک پر آ گئے۔ وزیر کی نگاہ اس ایک لمبی قطار پر جمی تھی جو دھیرے دھیرے حصار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آدھے گھنٹے تک ہم لوگ ریت کے ٹیلے پر کھڑے قافلہ کی طرف دیکھتے رہے۔ اتفاق سے فوج کے دوسرے دستہ کا کپتان وزیر محترم کے پاس بھاگا ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ آگے والے فوجی دستہ نے اطلاع دی ہے کہ سب لوگ بخیریت چل پڑے ہیں۔ اور راستہ صاف ہے۔ فوراً فوجی سلام کر کپتان نے اپنے سپاہیوں کو ساتھ لیا۔ اور قافلے کے پیچھے چل دیئے۔ مہاجروں کی حفاظت کے لئے یہ دوسرا فوجی دستہ تھا۔ اور قافلہ کے پیچھے چل رہا تھا۔

اس طرح ہمارے دیکھتے دیکھتے قافلہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر ہم نے اس میدان پر نظر ڈالی جہاں کئی دنوں سے ہزاروں آدمی پڑاؤ ڈالے تھے۔ وہ کھلا میدان بہت بھیانک

دکھائی دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے سینما اسکرین پر میں نے کوئی فلم دیکھی ہو۔ کچھ دیر تک ہم لوگ کھڑے رہ گئے۔ باڈی گارڈوں نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی۔ فوراً ہم لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں جا بیٹھے۔ نہ جانے کیوں سب کے ہاتھوں میں رومال تھے۔ منہ صاف کرنے کے بہانے سب نے آنسو پونچھے۔ میرا اندازہ ہے ایک بھی آنکھ خشک نہیں تھی۔

پروگرام کے مطابق وزیر محترم کو رہتک میں ان کے اعزاز میں دی جانے والی ایک دعوت میں شریک ہونا تھا۔ لیکن کلکٹر کے بنگلہ پر پہونچکر وزیر نے عذر پیش کیا اور یہ کہکر کہ طبیعت ٹھیک نہیں دلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ مقامی افسروں سے ملنے کے بعد ہم تین بجے رہتک سے الوداع ہوئے۔ اور پانچ بجے دلی آپہونچے۔ راستہ میں کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ جب اپنی رہائش گاہ پہ وزیر کار سے نیچے اترے میں نے یہ پوچھنا مناسب سمجھا: "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" جواب ملا: "بہت بری نہیں"۔

کچھ اور بات کئے بغیر میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ (اکتوبر ۱۹۴۷ء)

●●

(۳۱)

وطن کی یاد (نومبر ۱۹۴۹ء)

نوسال کے بعد اس ماہ مجھے اپنے آبائی گاؤں شہزادپور جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں پیدا ہوا اور چوتھے درجہ تک تعلیم پائی۔ وہاں پر ہمارا آبائی مکان جدید معیار کے مطابق ایک خاندان کے لئے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ایک بازار کے آخر میں واقع ہے۔ شہزادپور ایک بڑا خوشنما چھوٹا سا گاؤں ہے جو انبالہ۔ ناہن روڈ پر ان جگہوں کے وسط میں واقع ہے۔ تحصیل نرائن گڑھ سے اس کا فاصلہ صرف نو میل ہے۔

چونکہ وہ ایک اہم راستہ پر واقع ہے۔ جو انبالہ کو ہماچل پردیش (سابق سرمور ریاست) سے ملاتا ہے۔ اس لئے شہزادپور میں ہمیشہ مسافروں اور آمدورفت کی چہل پہل رہی ہے۔ دراصل اس گاؤں کی پوری معاشیات کا دارومدار ہی اس آمدورفت پر ہے۔ قدیم زمانہ میں جب بیل گاڑی یا اونٹ ہی آمدورفت کا واحد ذریعہ تھے شہزادپور بڑا اہم تجارتی مرکز تھا۔ یہاں پر ناہن کے پہاڑی علاقہ کی اشیاء آلو۔ مکئی۔ ادرک اخروٹ وغیرہ آکر فروخت ہوتی تھیں۔ موٹر لاری کے آجانے کی

وجہ سے اس کی کچھ اہمیت کم ہو گئی ہے۔ اور اب یہ چیزیں بجائے شہزاد پور کے انبالہ جانے لگیں ہیں۔

دیوالی کے چند روز بعد جب میں بس سے اترا۔ یہ تمام باتیں میرے ذہن میں ابھریں۔ بس اڈہ منڈی کے مرکز میں واقع ہے اور اسی لئے ذہن کا ان دنوں کی یاد کرنا لازمی ہے جب موٹروں والی سڑک نہیں تھی۔ بس اڈہ پورن چند کی دکان کے بالکل سامنے ہے۔ یہ شخص میرا خوب واقف ہے۔ اس لئے چند قدم چل کر میں اس کی دکان پر گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا مجھے خوش آمدید کہنے آیا۔ میرا سامان اس نے اپنی دکان میں رکھ لیا۔ میں نے اس سے کہا کہ کسی ذریعہ میرے گھر پر میری آمد کی اطلاع کرا دے۔

اس کے بعد ہم نے باتیں شروع کر دیں۔ پورن چند نے مجھے دنیا اور دنیا داری کی باتیں کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے میرے خاندان۔ میرے والد۔ بھائیوں کے بارے میں سوالات کی بوچھار کر دی۔ آخر کار ہم سالوں کے بعد مل رہے تھے۔ اور گاؤں کے لوگ پرانی باتوں کو بہت کم بھولتے ہیں۔ دس منٹ تک میں نے اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں اسے بتایا۔ میں نے بھی اخلاقاً اس سے اس کے اپنے اور اس کے خاندان کے بارے میں سوالات کئے۔

اس ذاتی و خاندانی خیر و عافیت کے بعد اب ہم نے گاؤں کے بارے میں گفتگو شروع کی۔ جب میں نے پورن چند سے اپنے اور اس کے ایک مشترکہ دوست کے بارے میں سوال کیا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ مگر مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے اسے رنجیدہ کر دیا ہو۔ اپنی انگلی کی ایک انگوٹھی کو ملتے ہوئے اس نے کہا کہ "سنہ ۱۹۴۰ء سے جب پچھلی مرتبہ آپ یہاں آئے تھے حالات بالکل بدل چکے ہیں اور ابھی ان حالات کو سمجھنے میں چند روز لگیں گے۔" اس نے مزید کہا۔ "مگر سب سے بڑی تبدیلی سنہ ۱۹۴۷ء میں آئی تم برکت کو جانتے ہو تمہارا پرانا دوست اور کلاس فیلو۔ جس نے معلمی کا امتحان پاس کیا تھا۔ اور جب تم اس سے نو سال پہلے ملے تھے تو وہ یہاں کے اسکول میں پڑھا رہا تھا۔ جب تم اپنے گھر جاؤ گے

کنویں کے قریب اس کا تین منزلہ مکان ملے گا۔ اس نے ۱۹۴۲ء میں معلمی کو چھوڑ اینٹیں بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ جب اس نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ گاؤں کو چھوڑا وہ تین بھٹوں کا مالک تھا۔ اس کے بھائی میتا نے کرتے پاجامے سینا چھوڑ کر کوٹ پتلون بنانا شروع کر دیئے تھے ۱۹۴۴ء میں اس نے گاؤں چھوڑ کر انبالہ چھاؤنی میں درزی کی دکان کھول لی تھی۔ جنگ کے دنوں میں ان لوگوں نے فالتو پیسہ دیکھا تھا۔ آہ بیچارے! ان کو سب کچھ یہیں چھوڑنا پڑا۔ معلوم نہیں اب ان کا پاکستان میں کیا حال ہے؟۔

یہ بڑی دلچسپ بات تھی۔ دراصل تقسیم کے بعد کے واقعات کی طرف ہی میں پورن چند کی توجہ دلانا چاہتا تھا۔ مگر میں جلد بازی سے کام لے رہا تھا۔ اب پورن چند کہانی سنانے کے لئے تیار تھا۔ برکت اور اس کے بھائی کے سرسری ذکر نے میرے تجسس کو بیدار کر دیا تھا۔ اور اب میں باقی لوگوں کے بارے میں جاننے کے لئے بیچین تھا۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے بتائے شہزاد پور کے دو ہزار مسلمان کب اور کیسے گاؤں سے چلے گئے۔ پورن چند نے فوراً میرے سوال کا جواب دیا۔ پورن چند ایک ماہر کہانی گو ہے۔ وہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو واقعہ کی جزیات اور تفصیلات میں دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔ میرے تھوڑا قریب آ کر اس نے کہنا شروع کیا "ستمبر کے وسط میں انبالہ سے خبریں آنے لگیں کہ ایک بڑی تعداد میں مسلمان پاکستان ہجرت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک کیمپ میں جمع ہو گئے تھے۔ اور آمد و رفت کی آسانیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اس خبر نے یہاں کے مسلمانوں کو قدرے پریشان کر دیا۔ وہ حیران تھے کہ کیا ان کے لئے یہ مناسب ہو گا کہ وہ یہاں ٹھہرے رہیں جبکہ انبالہ میں ان کے عزیز و دوست پاکستان جا رہے تھے۔ ہم ان کی پریشانی اور بیچینی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چودھری مختار سنگھ کو گاؤں میں سبھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ مسلمانوں سے ملنے گئے تاکہ وہ ان کے خیالات جان سکیں۔ یہ جان کر کہ تمام مسلمان انبالہ کے مسلمانوں کے ساتھ پاکستان جانے کے لئے بیچین ہیں چودھری نے پورے

گاؤں کا جلسہ بلایا۔ گاؤں کے تمام ہندوؤں نے ہر ممکن مدد اور حفاظت کی پیش کش کی۔ اگلے دن تمام مسلمانوں نے دیولیا کے میدان میں جمع ہونا شروع کیا۔ دس دن میں تقریباً پورا گاؤں وہاں جمع ہو گیا۔ صرف ہندو رات کو گھر واپس آجاتے تھے۔ ہر شخص رنجیدہ تھا کیونکہ کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ مسلمان جائیں۔ چاروں طرف جدائی اور رخصت کے جذبات انگیز مناظر تھے۔ آخر کار وہ دن بھی آگیا جب ان کو روانہ ہونا تھا۔ ان میں سے تقریباً پانچسو نرائن گڑھ کے راستہ سدھورا روانہ ہو گئے اور باقی انبالہ چلے گئے۔ دونوں راستوں پر سیکڑوں ہندو ان کے ساتھ گئے۔ ان کی روانگی کے کچھ دنوں بعد تک پورا گاؤں رنج و افسردگی میں ڈوبا رہا۔ پڑوس کے ایک درجن گاؤں اسی طرح خالی ہو گئے۔ ہر شخص نے اس خلا کو محسوس کیا۔"

یہاں پورن چند اپنی آستین سے آنکھیں پونچھنے کے لئے رکے۔ اس کو اس کے پرانے دوست یاد آرہے تھے۔ میں اس سے پوچھنے والا تھا کہ کیا کوئی باقی بھی رہ گیا ہے کہ اسی وقت پورن چند نے سلسلہ کلام جاری کیا۔" صرف ان میں سے پانچ ہمارے ساتھ باقی رہ گئے ہیں۔ تکیہ کے سائیں کریم بخش کی رہنمائی میں ان لوگوں نے جانے سے قطعی انکار کر دیا اور یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ آج ان کو اپنے فیصلہ پر افسوس نہیں ہے۔ اگرچہ بعض اوقات وہ اپنے دوستوں و عزیزوں کی کمی محسوس کر کے افسردہ ہو جاتے ہیں۔ سائیں پہلے کی طرح ہیرو بنے ہوئے ہیں۔ وہ ایک غیر معمولی انسان ہیں۔ اس انقلابی تبدیلی سے وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہیں۔ ایک ہاتھ میں اپنا ستارا اور دوسرے ہاتھ میں بھیک کا پیالہ لئے وہ آج بھی آٹا مانگتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا تکیہ آج بھی بچوں کے لئے کھیل کا میدان ہے۔ حسب سابق اس سال بھی ہم نے وہاں اپنا دسہرہ کا میلہ لگایا۔ ہر شخص تہوار کی خوشی و ترنگ میں تھا۔ شام کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ املی کے نیچے سائیں صاحب اپنے چبوترہ پر ایسے بیٹھے تھے جیسے کسی کانفرنس کی صدارت کر رہے ہوں جیسا کہ تم جانتے ہو سالوں سے یہ تقریب سائیں کی ہی تقریب کہلاتی ہے۔

جب پورن چند باتیں کر رہا تھا میں نے گما کو آتے دیکھا۔ وہ ہمارا پرانا نوکر تھا۔ گما ان باقی ماندہ پانچ مسلمانوں میں سے ایک تھا جو یہاں رہ گئے تھے۔ یہ شخص ہمارے یہاں چالیس سال سے بھی زیادہ سے کام کر رہا تھا۔ گاؤں میں سبھی لوگ نہیں جانتے تھے کہ آیا وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اس دن اس کے مسلمان ہونے کی حقیقت پہلی بار میرے ذہن سے ٹکرائی۔ گما تین سال پہلے مجھ سے دلّی میں ملا تھا۔ اس میں بظاہر کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی۔ پورن چند کی اجازت لے کر اور اس سے شام کا کھانا اس کے یہاں کھانے کا وعدہ کر کے میں گما کے پیچھے پیچھے گھر کی طرف چلا۔

وہاں پہونچکر مجھے معلوم ہوا کہ گھر میں چھ شرنارتھی خاندان رہ رہے ہیں۔ مالک مکان کے ایک نمائندے کی حیثیت سے میں ان سے ملا اور ان کو خوش آمدید کہا۔ وہ سب کاروباری لوگ تھے سوائے ایک کے جو ٹرینڈ ٹیچر تھا۔ شہزاد پور میں آئے دوسرے بہت سے شرنارتھیوں کی طرح یہ لوگ بھی ضلع جھنگ سے آئے تھے۔ ابتدائی دور میں تین ہزار کے قریب یہ لوگ آئے اور یہیں بود و باش اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر ایک مہینہ کے بعد ان میں سے نصف دوسری جگہوں کے لئے روانہ ہو گئے۔ بارہ سو شرنارتھی آج بھی اس گاؤں میں آباد ہیں۔ اگرچہ گاؤں کے قدیم باشندے تعداد میں زیادہ ہیں مگر یہ نووارد ہر شعبہ زندگی میں چھا گئے ہیں وہ گاؤں کے ہر پیشہ اور ہر کام میں داخل ہو گئے ہیں۔ پوسٹ آفس۔ گاؤں کا اسکول اسپتال۔ کاروبار غرض ہر پیشہ میں ان کا دخل ہے۔ ان خاندانوں میں جو ہمارے گھر میں آکر آباد ہوئے تھے ایک خاندان عیسائی پادری کا بھی تھا۔ جو شیخو پورہ سے آیا تھا۔ وہ سب ایک خاندان کی طرح رہ رہے تھے۔ اور انہوں نے شہزاد پور کے بارے میں بہت سی کہانیاں مجھے سنائیں۔

اگلے دن پورن چند اور چودھری مختار سنگھ کے ساتھ میں گاؤں میں دوسرے دوستوں سے ملنے گیا۔ ہم نے وہ محلے بھی دیکھے جہاں پہلے مسلمان رہتے تھے اور اب شرنارتھی آباد ہو گئے تھے۔ نووارد بڑی تیزی سے زمین میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہے تھے۔ اور تقسیم کے لگائے کاری زخم کی چوٹ کو

بھولتے جارہے تھے۔مجموعی اعتبار سے گاؤں میں زندگی پرسکون اور اطمینان بخش معلوم ہوتی تھی اگرچہ گاؤں کے لوگ مسلمانوں کی جدائی کو فراموش نہیں کر پائے تھے۔ مگر انہوں نے نوواردوں کی آؤ بھگت میں بھی کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا تھا۔اس معاملہ میں ان کے لئے کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنے مسلمان دوستوں کو یاد رکھنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ ان کے جانے کی وجہ سے گاؤں کی معاشیات بری طرح متاثر ہوئی تھی۔تمام لوہار اور کاریگر گاؤں سے چلے گئے تھے کچھ ہندو اور سکھ لڑکوں نے اب ان پیشوں کو سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ مگر وہ ابھی سیکھنے کی ہی منزل میں تھے۔ نئے آنے والوں میں سے کسی نے بھی ہتھوڑا نہیں پکڑا تھا۔

سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ گاؤں کی تمام دائیاں مسلمان تھیں اچانک ان کے غائب ہو جانے پر ایک ناقابل حل گھریلو مسئلہ پیدا ہو گیا۔چند نرسوں اور دائیوں کو انبالہ سے بلایا بھی گیا مگر وہ ناکافی تھیں۔

یہ وہ ابتدائی دشواریاں تھیں جو آج ۱۹۴۹ء میں بھی درپیش ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں جو صدیوں کے قائم شدہ رشتوں کی یادوں کو بھولنے نہیں دیتے۔ مگر انسان میں بڑی لچک ہے کہ وہ صورت حال کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔اب لوگ ان دشواریوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ سائیں کریم بھی سوچنے لگے ہیں یہ پورا ہنگامہ وقتی دور تھا۔جو گزر گیا۔ وہ کہتے ہیں انسان کی زندہ رہنے کی خواہش مصائب کے مقابلہ میں زیادہ توانا ہے۔مصائب اور زندگی جب دونوں میں جھگڑا ہوتا ہے تو ہمیشہ اوّل الذکر کو ہی نیچا دیکھنا پڑتا ہے۔

چار دن اور شہزادپور میں قیام کے بعد میں بھی یہی سوچنے لگا ہوں۔

●●

۳۲

کچھ آپ بیتی

ایک وقت وہ تھا جب میں سرکاری نوکری اور ادب کو ایک دوسرے کا مخالف خیال کرتا تھا۔ سرکاری ملازمت سے پہلے میں ایک آزاد صحافی تھا اور سال بھر میں مجھے لکھنے کی بیماری ہو گئی تھی مجھے یاد ہے پہلی بار جب میرے دو مضمون اخباروں میں چھپے تو میری کیا حالت ہوئی تھی۔ جیسے ہنڈولے پر بیٹھا آدمی چکر کھاتا ہے۔ اور اس کے جسم میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ ویسی ہی میری حالت تھی۔ اس لئے لکھنا میری سب سے پیاری ہوبی بن گیا۔ اس میں مجھے ولولہ۔ جوش۔ آدرش۔ دلچسپی سبھی کا لطف آنے لگا۔ دوسرے یہ بھی سن رکھا تھا اور کہیں پڑھا بھی تھا کہ سرکاری نوکری لکھنے کی طاقت اور خواہش دونوں پر حملہ آور ہوتی ہے۔ لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ سرکاری نوکری میں وہی پنپ سکتا ہے جو کاغذ پر کم سے کم لکھے۔ نہ لکھے گا نہ غلطی ہوگی۔ اس لئے ریکارڈ اچھا رہے گا۔ اور جو آدمی جیسے خیالات آئیں لکھنے کو دوڑ پڑے گا۔ وہ لازمی کہیں نہ کہیں غلطی کرے گا اور پکڑا جائے گا۔ اور سرکاری ملازم نے جہاں کاغذ پہ غلطی کی وہ قربانی کا بکرا بنا۔

سرکاری نوکری کے بارے میں میرے ایسے خیالات تھے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے ان خیالات کا مالک ہوتے ہوئے بھی جنگ شروع ہوتے ہی میں سرکاری مشین کا ایک پرزہ بن گیا۔ شروع میں بہت کوشش کی کہ کاغذ پر کچھ نہ لکھا جائے زبانی جمع خرچ سے ہی کام پورا کیا جائے۔ پر مجبور ہو گیا۔ جس شعبہ میں میں نوکر ہوا وہاں کام ہی لکھنے کا تھا۔ اب کیا کرتا نہ لکھتا تو نکال دیا جاتا۔ جو کام کچھ دن بہ مجبوری کرنا پڑا۔ اسی میں دھیرے دھیرے لطف آنے لگا۔ کبھی کبھی میں اپنی کوشش پر خود ہنستا۔ ایک دو بار ایسا ہوا کہ سرکاری معلومات کی بنیاد پر ہم نے جسے ڈانٹا ۴ دن بعد جنگ میں وہی گروپ جیت گیا اور جسے ہم جیتنے والا کہتے تھے وہ ہار گیا۔ ایسے موقعوں پر اگر جھینپ و شرمندگی کا مقابلہ کرنا پڑا تو تفریح بھی کم نہیں ملی۔ اور لکھنے میں جہاں لطف و تفریح ملے سمجھو لکھنے والے کو اس کا انعام مل گیا۔

جنگ ختم ہوئی۔ وقت بدلا۔ زندگی اپنے معمول پر آگئی۔ سرکاری ملازمت کے حالات میں بھی کچھ تبدیلی ہوتی نظر آئی۔ لکھنے لکھانے کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ زندگی کی لہر خاص طور پر ہمارے ملک میں بہت سے غیر معمولی حالات سے ٹکرا رہی تھی۔ ساحل پر کھڑا کوئی بھی تماشائی کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ مجبوراً لکھنے کو دل چاہا۔ پھر بہتوں نے رنگا رنگ خاکے بنائے۔ ان میں کچھ تو بہت ہی دلکش تھے۔ اور جنگی ادب کے غیر فانی شاہکار بن گئے۔ سرکاری نوکر پل بھر کے لئے اپنی حدود کو بھول گیا۔ اگر پہلا دور ہوتا تو شاید کسی کو پچھتانا پڑتا۔ شاید کوئی پریشان بھی کیا جاتا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سرکاری ملازمین کو احساس ہوا کہ آزادی کی لہر کسی کے ساتھ امتیاز نہیں کرتی ہے۔ وہ سبھی دیش میں رہنے والوں کے لئے جوش و خوشی کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرا پہلا خیال کہ سرکاری نوکر کو ادبی کاموں سے علیحدہ رہنا پڑتا ہے غلط نکلا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ سبھی سرکاری ملازمین میری رائے سے اتفاق کریں گے۔ ہو سکتا ہے

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ میری ابتدائی رائے ہی صحیح تھی اور جسے میں غلط نہیں سمجھتا ہوں وہ صرف تخیل سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ مشہور مفکر اور ادیب سی آئی ایم جوڈ بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کی چار بڑی بھولوں پر ایک خوبصورت مضمون لکھا ہے۔ ان میں سے سب سے بڑی اور پہلی بھول وہ یہ بتلاتے ہیں کہ انہوں نے سرکاری نوکری کی اور ۱۶ برس تک اس میں پھنسے رہے۔ نوکری سے اکتانے کے ان کے پاس کئی اسباب تھے۔ ایک تو جس رفتار سے سرکاری کام ہوتے ہیں انہیں وہ پسند نہیں کرتے تھے وہ فوراً سوچ و فکر کے بعد اپنے منصوبہ کو ایک دم عملی جامہ پہنانے کے حق میں تھے۔ جبکہ سرکاری منصوبے پال کے آموں کی طرح دھیرے دھیرے پکتے ہیں۔ دوسرے انہیں آئے دن کی سرکاری میٹنگوں سے چڑ تھی۔ جوڈ کے خیال میں یہ کانفرنس یا میٹنگ تضیع اوقات سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور لوگ صرف گپ ہانکتے ہیں۔ تیسرے۔ دوسرے سرکاری افسروں کی طرح ان سے امید کی جاتی تھی کہ وہ صاف ستھرے اور ایک خاص ڈھنگ کے کپڑے پہنکر دفتر آئیں۔ جوڈ صاحب سست آدمی تھے۔ انہیں اپنے کپڑوں کی طرف دیکھنے کا شوق نہیں تھا۔ آخر میں جوڈ کو لکھنے کا شوق پڑ گیا۔ اور اس سوال پر انہیں برطانیہ کی سول سروس سے ہٹنا پڑا۔ انہوں نے لکھا کہ میرے مضامین سے میرا محکمہ تنگ آگیا۔ اور آخر میں سول سروس کا دیوتا سولہ برس تک مجھے ہضم کرنے میں ناکام رہا اور اس غلامانہ زندگی کی آنتیں بھی مجھے سنبھال نہ سکیں اور اس نے مجھے اگل دیا۔

اس بات کو میں مستثنیٰ شمار کرتا ہوں۔ خود جوڈ صاحب بھی ایک مستثنیٰ ہی شخص ہیں۔ اس لئے دوسرے معمولی سرکاری ملازمین اگر جوڈ صاحب کی بات سے اتفاق نہ کریں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ معمولی انسانوں کے درجہ میں ہونے کا بھی تو کوئی فائدہ ہے۔

آنکھ کان کھلے رہنے چاہئیں۔ ادب اور ادب کے مطالعہ کے لئے مواد کی کہیں کمی نہیں ہے۔ سرکاری دفتروں کو تو میں اس کام کے لئے زرخیز میدان سمجھنے لگا ہوں اس کے بھی کچھ اسباب ہیں۔

سنیئے۔

اولاً۔ سرکاری دفتروں کا ماحول باہر کے ماحول سے بالکل مختلف ہے گھر میں اگر آپ کو کچھ چاہیئے آپ اسے میز پر سے اٹھا لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز سامنے نہ دکھائی دے تو کسی کو کہکر منگا لیتے ہیں۔ دفتر میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں جو کچھ کہنا ہو یا لینا ہو اس کے لئے لکھ کر دینا ہی مناسب سمجھا جاتا ہے۔ دفتر میں قلم زیادہ چلتا ہے زبان کم۔ مانا۔ اس کی بھی مناسب وجہ ہے کیونکہ ہر چیز کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ پر وجہ کچھ بھی ہو یہ بھی ایک خصوصیت ہے۔

دوسرے۔ سرکاری نوکروں کو اپنی شخصیت اتنی بڑی دکھائی دیتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دفتر کی عظیم عمارت بھی چھوٹی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے حساب کتاب میں اپنی چھٹی میں اور اپنی ترقی کے ذکر واذکار میں اسقدر الجھے رہتے ہیں کہ انہیں پتہ ہی نہیں رہتا کہ گھڑی میں کیا بجا ہے۔ اور آسمان پر سورج کی کیا حالت ہے۔ میرے ایک دوست ہیں جنھیں سرکار سے تیرہ روپیہ وصول کرنے ہیں۔ جو انہوں نے ڈاکٹر کو سرکاری فیس کے لئے دیئے تھے۔ پورا دفتر ان کے اس معاملہ کو جانتا ہے جن دنوں آسام بہار اور مغربی بنگال میں سیلاب کی بھیانک خبریں آرہی تھیں وہ مجھے کناٹ پلیس میں مل گئے۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب تھے۔ جو مصیبت زدوں کے لئے چندہ اکٹھا کر رہے تھے۔ میرے دوست سے بھی انہوں نے چندہ مانگا۔ بس چندہ کی جگہ انہوں نے اس فائل کے سب نوٹ زبانی سنا دیئے جن کا ۱۳ روپیہ کی وصولی کے لئے جنم ہوا تھا۔

یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ دفتر کی دیواروں میں کچھ ایسا اثر ہے کہ وہاں بیٹھنے والا کبھی کبھی ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ اور ساری دنیا کو ذاتی مسائل کے پیمانہ سے ناپتا ہے۔ اکثر ہمیں ذاتی نوکری کی ترقی دنیا کی فلاح وبہبود سے زیادہ اہم معلوم ہوتی ہے۔

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ سرکاری ملازم دوسرے لوگوں سے کم سمجھدار یا کم وسیع النظر ہے۔

یہ بات نہیں۔ مگر پھر بھی ماحول کا خاص اثر ہوتا ہے۔ جو سبھی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں تخلیق ادب سہل ہی نہیں بلکہ لازمی ہو جاتا ہے۔ دفتری زندگی کے واقعات کبھی کبھی تخیل کو اسقدر تیز کر دیتے ہیں کہ تخلیق انہیں چیلنج سمجھ کر صفحہ قرطاس پر آنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ جب کبھی سرکاری ملازم کا ان غیر معمولی اور مشکل موضوعات سے سامنا ہوتا ہے جن سے قوم و ملک کے زیادہ تر لوگوں کی سیاسی و سماجی خواہشات وابستہ ہوتی ہیں تو وہ حیران و بے حس سا ہو جاتا ہے۔ ان موضوعات کے بارے میں اس کے اپنے خیالات و پروگرام ہوتے ہیں۔ جو دیر سویر اظہار کا ذریعہ تلاش ہی کر لیتے ہیں۔ تخلیق ادب جس قوت تخیّل کے سہارے چلتی ہے اور جس طرح کے مواد سے اس کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ سرکاری ملازم کا آئے دن اس سے واسطہ رہتا ہے۔

ہم کیسے بھول سکتے ہیں کہ برطانوی دور کی بہت سی مستند کتابوں کی تخلیق ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومت کے اعلیٰ افسروں کے ذریعہ ہی عمل میں آئیں۔ تاریخ۔ جغرافیہ سائنس۔ زبان اور خود ہندی زبان کی تاریخ اور پیدائش۔ ان گہرے مضامین پر آج بھی جو مستند مواد ملتا ہے وہ سرکاری افسروں کی ہی محنت کا نتیجہ ہے۔ آزاد ہندوستان کا سرکاری ملازم بھی گل کرائسٹ۔ ٹوڈ۔ گریرسن کو آئیڈیل لویب مانتا ہے۔ اور ان کے نقش قدم پر چلکر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہے۔

تو بھی پہلے کی بات کچھ اور تھی۔ اس وقت سرکاری ملازم عوام سے الگ تھلگ تھا۔ اور جب وہ کچھ کہتا تو ایسا لگتا جیسے کوئی اونچے مینار پر چڑھ کر عوام کی طرف کچھ پھینک رہا ہے۔ آج وہ بات نہیں۔ اب علیحدگی پسندی سرکاری ملازمت کی علامت نہیں۔ درمیانی درجہ کے لوگوں کا معمولی گھر۔ گاؤں والوں کی جھونپڑی۔ کسان کا کھیت چرواہوں کی چراگاہ۔ یہ سبھی سرکاری ملازموں کی حدود میں آتے ہیں۔ اور دائرہ عمل کی اس وسعت پر اسے فخر ہے۔ تصنع۔ تعصب۔ اونچ نیچ کا احساس وغیرہ یہ سب ادبی تخلیق کے دشمن ہیں، اور آج کا سرکاری ملازم ان برائیوں سے آزاد ہو چکا ہے۔ اس لئے خدمت ادب کے لئے اس کا راستہ کھلا ہوا سمجھنا چاہیئے۔

●●

(۳۴)

قومی یکجہتی اور اقلیتیں[1]

قومی زندگی میں اقلیتوں خاص طور پر مسلمانوں کے لئے ایک سازگار اور برادرانہ ماحول پیدا کرنے کے لئے جو دشواریاں درپیش ہیں پچھلے دنوں ان کے بارے میں اخباروں اور تقریروں میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس مسئلہ نے جو سوال کھڑا کیا ہے وہ اقلیتوں کے اس سوال سے قطعی مختلف ہے جس کا سامنا برطانوی راج میں تھا۔ ہماری قسمت کے آقا ——— انگریز ——— اس سوال سے اسی طرح کھیلتے رہے جس طرح ایک بچّہ پالتو کتّے سے کھیلتا ہے وہ کتّے سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کی پوری طرح دیکھ بھال کرتا ہے۔ مگر اس کو اتنا نہیں ستاتا کہ کاٹ کھائے۔ انگریزوں کے لئے اپنے مفاد میں توازن قائم رکھنے کا یہ ایک بہترین کھیل تھا۔ مگر آج مسئلہ کی نوعیت قطعی بدل گئی ہے۔ آج حکومت اور ہمارے قومی رہنما پوری ایمانداری اور خلوص سے قومی زندگی کے

---

[1] دوستوں کی ایک چھوٹی سی محفل میں اس موضوع پر مجھ سے بحث کا آغاز کرنے کے لئے کہا گیا۔ بحث شروع کرتے ہوئے میں نے اس طرح مضمون کا آغاز کیا۔

متضاد عناصر کو ایک ہم آہنگ وحدت میں سمونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ تاکہ ہندوستانی آبادی کا ہر طبقہ اپنے کو محفوظ محسوس کر سکے اور قومی زندگی کی تعمیر میں نمایاں رول ادا کر سکے۔

اگر ہندوستانی حکومت اور رہنماؤں کی نیت وارادہ شکوک وشبہات سے بالاتر ہے تب کیا وجہ ہے کہ قومی اتحاد کا مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے؟ سوال اصلیت پر مبنی ہے اور مناسب اور صحیح جواب چاہتا ہے۔ چونکہ مسلمان ہمارے ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ ان کا موجودہ طرز فکر ہی وسیع پیمانہ پر بحث کا موضوع رہا ہے۔ اس لئے ہم اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے کو مسلمانوں کے مسئلہ تک ہی محدود رکھیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کے بعد سے مسلمان مجموعی طور پر اپنے کو ملکی و قومی زندگی کے دھارے سے ہم آہنگ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس طبقہ میں مایوسی ہے۔ خوف ہے احساس شکست ہے اور اپنے غیر محفوظ ہونے کا احساس ہے۔ باوجودیکہ حکومت ہند نے برخلاف پاکستان کی مذہبی حکومت کے مسلمانوں کو اعلیٰ اور ذمہ داری کے عہدوں پر مقرر کیا ہے۔ لیکن اسکے باوجود مسلمانوں کی اکثریت ایک گھٹی ہوئی زندگی گذار رہی ہے۔ ان کے یہ احساسات ملک کی تقسیم اور تقسیم کے بعد ہونے والے واقعات کی طرف ان کے اپنے ذاتی ردعمل کا نتیجہ ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت تنہائی اور علیحدگی پسندی کو مسلمانوں کے اسی ذاتی ردعمل اور ملک میں رونما ہونے والے حقیقی واقعات کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے حقیقی واقعات کو بیان کرنا چاہئے۔ ان واقعات میں سب سے زیادہ اہم ملک کے مختلف حصوں میں اکثر وبیشتر ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ اگرچہ حکومت نے ہمیشہ ان کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان فسادات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بد دلی اور غیر محفوظ ہونے کے احساس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے ساتھ ناخوشگوار تعلقات۔ اور فرقہ وارانہ فسادات کو اس تنازعہ سے وابستہ کرنے کا رجحان اور

خاص طور پر پاکستان کی ہندو مخالف پالیسی مسلمانوں کے خوف و ہراس میں اضافہ کا سبب بنی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں بہت سے بجا طور پر محسوس کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں کہ پاکستان میں جو کچھ ہوتا ہے یا پاکستان جو کچھ کرتا ہے اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ سوچتے ہیں کہ پاکستان کی فروگذاشت کو سیکولر ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی پرامن زندگی کو پراگندہ کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ یہ ایک ایسی دلیل ہے جس سے ہندوستان کے تمام پڑھے لکھے طبقے اتفاق کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان فسادات میں اشتعال انگیزی ہمیشہ ہندوؤں کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔ یہ غلط مفروضہ ہے۔ ان فسادات کے پیچھے کوئی بھی سبب یا کوئی بھی ایجنٹ ہو تمام فرقہ وارانہ فسادات کا ہندوستانی مسلمانوں پر ایک طبقہ کی حیثیت سے ایک ہی اثر ہوتا ہے۔

ایک اور دوسرا سبب ہے جو مسلمانوں کے علیحدگی پسند رجحان کا ذمہ دار ہے وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کو آزاد ہندوستان میں سرکاری ملازمتوں کے لئے اس قدر مواقع حاصل نہیں ہیں جو انہیں آزادی سے پہلے حاصل تھے۔ اصولی طور پر وہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ملازمتوں کے لئے کہیں بھی بھرتی کا معیار قابلیت ہوتا ہے۔ تاہم وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ وہ جہاں تک نوکری کے مواقع کا تعلق ہے اکثریتی طبقہ بلکہ دوسری اقلیتوں کے مقابلہ میں بھی پیچھے ہیں نوکریوں کا ایک اقتصادی و معاشی پہلو بھی ہے۔ اس لئے فطری طور پر نوکریوں کے امکانات میں اپنا حصہ نہ پاسکنے کی وجہ سے (چاہے اس کے اسباب کچھ بھی ہوں) مسلمان سخت متاثر ہوئے ہیں۔

تیسرا سبب جس نے مسلمانوں کے احساس شکست و مایوسی میں اضافہ کیا ہے وہ یہ خوف ہے کہ ان کا روائتی طرز زندگی۔ ان کا مذہب و کلچر اور ان کا مخصوص طرز فکر خطرہ میں ہے۔ یہ خوف خیالی ہے یا حقیقی اس سے بحث نہیں۔ ان کا یہ احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب

وہ قومی زندگی کے تمام شعبوں میں ہندوازم کے احیا و تجدید کی علامتیں دیکھتے ہیں تمام موقعوں پر قومی کلچر جو مسلمانوں کی نظر میں ہندو کلچر ہے کی ہمت افزائی ہوتی ہے وہ کچھ جارحانہ فرقہ پرست جماعتوں کو جو دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن ہیں ان رجحانات کا سیاسی مظہر سمجھتے ہیں۔ ملک کی تقسیم اور اس کے بعد ہونے والے واقعات کے تئیں مسلم طبقہ کا ذاتی ردعمل بھی ان کے احساس شکست میں کچھ کم اضافہ کا باعث نہیں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ پاکستان کی مانگ کے پیچھے مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس میں ہندو اکثریت والے صوبوں کے مسلمان بھی شامل تھے۔ چونکہ ان میں سے زیادہ تر مسلمان ہندوستان ہی میں رہ رہے ہیں۔ اس لئے وہ ایک احساس جرم کا بھی شکار ہیں جو بہرحال شکست خوردگی کا نتیجہ ہے۔ یہ احساس اور دوسرے مندرجہ بالا عوامل نے ملکر مسلمانوں کو اس ذہنی حالت پر پہونچادیا ہے جہاں وہ علیحدگی پسندی میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آزادی کے بعد جو تبدیلیاں آئی ہیں مسلمان اپنے کو مجموعی طور پر ان سے ہم آہنگ نہیں کر سکا ہے۔

قومی ایکتا کے مسئلہ پر غور کرتے اور ان مشکلات کا تجزیہ کرتے وقت جو مسلمانوں کو اس وقت درپیش ہیں ایک خطرہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ انسانی ہمدردی اور انسانیت کے احساس کے پیش نظر مسلمانوں کی مفلوک الحالی اور ان کے مصائب ہماری نظر میں زیادہ معلوم ہو سکتے ہیں روشن ذہن اکثریتی طبقہ کا مسلمانوں کے تئیں یہ ردعمل اسی قدر فطری ہے جیسا کہ مسلمانوں میں احساس مجبوری و مایوسی۔

ماضی کا تجربہ اور تاریخی نظیر ہی صرف اس ردعمل کی اصلاح کا مواد فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا اس نوعیت کی مصیبت میں پھنس جانا کسی قوم کے لئے پہلا موقع ہے؟

اس سوال کا جواب پانے کے لئے دور دراز ماضی کے ہنگاموں سے حوالے دینا بے سود ہے مثلاً اس بات کو یاد کرنا بے معنی ہوگا کہ دلی سلطنت اور اس کے بعد آنے والی مسلم مملکتوں میں ہندو ایک قوم کی حیثیت سے کہیں زیادہ سنجیدہ و شدید محرومیوں کا شکار رہ چکے ہیں۔ وہ سب کچھ تو اب بھولا بسرا اور بے جان ماضی ہے اس مقصد کے لئے تو صرف ان مصائب و مشکلات کو یاد کرنا زیادہ صحیح ہوگا ایک سو سال پہلے مسلمان جن کا شکار تھا۔ ۱۸۵۷ء میں آج جس کو آزادی کی پہلی لڑائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ہندوستان میں رہنے والا ہر مسلمان انگریز حکمرانوں کی نگاہ میں مشتبہ تھا۔ مسلمانوں پر ہر طرح ظلم و ستم کیا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ اجتماعی طور پر قربانی کا بکرا بنے رہے۔ پوری قوم کی ہمت پست ہو چکی تھی۔ مستقبل کے لئے کوئی راستہ سوجھائی نہیں دیتا تھا۔ بہت سے لوگوں کا تو خیال تھا کہ ان کی حالت ناقابل علاج ہے۔ مغلیہ سلطنت کی آخری شمع بھی گل ہو گئی۔ بہت سے ممتاز مسلمانوں کو گرفتار کر کے ان کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے۔ ہزاروں کو ان کی جائداد سے محروم کر دیا گیا۔ انگریز حکمرانوں کا مسلمانوں کو سدا کے لئے تباہ کر دینے کا مصمم ارادہ کوئی راز کی بات نہیں تھی۔

پچھلی صدی کے نصف آخر میں مسلمان جس غار مذلت میں پہونچ چکا تھا اگر کوئی شخص اس کا حال جاننا چاہتا ہے تو اس کو سر سید احمد خاں اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں اس دور کی مسلم سوسائٹی کے حالات پڑھنے چاہئیں۔ اس دور کے حالات کا آج کے حالات سے مقابلہ کیجئے تو فرق نمایاں طور پر نظر آسکتا ہے۔ اگر مسلم طبقہ ان بے پناہ مایوس کن حالات پر کامیابی کے ساتھ فتح پا سکتا ہے جبکہ پوری حکومت کی طاقت اس کے خلاف تھی اور حکمراں بھی غیر ملکی تھے تو کیا اب مسلمانوں کا اپنے آپ کو سنبھالنا غیر متوقع بات ہوگی جبکہ حکومت اور لیڈر شپ دونوں — جن میں خود ان کی نمائندگی بھی شامل ہے۔ ان کی فلاح و بہبود کے خواہش مند ہیں۔

اسی وجہ سے ان لوگوں سے اتفاق کرنا مشکل ہے جو مسلمانوں کے سلسلہ میں قنوطی نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے تئیں ان کی حد سے بڑھی ہمدردی نے ان کے صحیح زاویہ نگاہ کو مسخ کر دیا ہے۔ جو وقت کے ساتھ قدم ملاکر چلنے میں ناکام رہے ہیں ان کے ساتھ ہمدردی کرنا اچھا ہے۔ اچھا ہی نہیں بلکہ قابل تعریف ہے۔ لیکن حالات کی خوفناک تصویر کھینچنا ہمارے قومی یکجہتی کے اصل مقصد کو ہی ناکام بنا دیتا ہے۔ ہمیں اپنے پر اور مسلم طبقہ پر اعتماد رکھنا چاہئے۔ مسلمان اپنی اندرونی توانائی و طاقت کے لئے مشہور ہے۔ ہمیں ان کو ان کے خول سے باہر نکالنے کی کوشش جاری رکھنی چاہئے اور ان کو وسیع تر مواقع بہم پہونچانے چاہئیں لیکن اسی کے ساتھ ہمیں ایک لمحہ کے لئے یہ تصور بھی نہیں کرنا چاہئے کہ مسلمانوں کا پورا طبقہ مفلوج ہو چکا ہے

اس مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے کہ مسلم عوام کے اندر سے جہالت اور توہم پرستی کو دور کیا جائے۔ ان میں تعلیم کو عام کیا جائے اور اگر ضروری ہو تو مسلم پس ماندہ طبقوں کے طلبا کو مراعات بھی دی جائیں۔ قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں کتنی ہی ترقی ہوئی ہو۔ کم از کم تعلیم کے میدان میں ہم خاطر خواہ ترقی نہیں کر پائے ہیں۔ اور مسلمان تو اس میدان میں ہم سب سے پیچھے ہیں۔

اس معاملہ میں مثبتی فکر و عمل کی ضرورت ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ مسلمانوں کو سماجی قوانین کے دائرہ عمل سے مستثنیٰ قرار دیکر ہم نے ان کو ہندوستانی سماج سے ہم آہنگ کرنے کا ایک بہترین موقع کھو دیا ہے۔ شادی و وراثت سے متعلق قوانین و سوشل کوڈ کا مسلمانوں پر نفاذ نہ کر کے بہت بڑی غلطی کی گئی ہے۔ اگر حکومت اس ملک کی سرزمین پر رہنے والوں کو ایک متحدہ اور ہم آہنگ قوم بنانے کی سچی خواہش رکھتی ہے تو اس کو اس غلطی کو درست کرنا ہوگا۔ یہ قدم آخر کار مسلمانوں میں اپنے ملک کے تئیں اپنائیت کا جذبہ پیدا کرے گا اور آنے والی نسلوں کو قدامت پرستی کے دائرہ سے باہر لانے میں معاون ثابت ہوگا۔

متذکرہ بالا بیان اس بحث و مباحثہ کا خلاصہ ہے جو ایک دن ایک ممتاز صحافی کے گھر پر ہوا تھا۔ ہم سب ملا کر چھ افراد تھے۔ مندرجہ بالا سطور میں مسئلہ کا جو تجزیہ اور حل پیش کیا گیا ہے اس پر ہم سب متفق تھے۔ صرف ایک اشفاق حسین کو اختلاف تھا۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن چونکہ مسلم ذہن کے بارے میں ان کے خیالات اس بحث کے لئے نہایت مفید ثابت ہوں گے۔ اس لئے میں نے اصرار کیا کہ وہ کھلے دل اور بے تکلفی سے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

اشفاق نے دو باتیں کہیں:۔ انہوں نے کہا اردو کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے مسلمان اسکو اکثریتی فرقہ کے خلوص کی کسوٹی قرار دیتا ہے۔ دوئم، ان کا خیال تھا کہ جہالت۔ توہم پرستی اور علاقائیت سے جنگ کے لئے ہندوؤں کو پیش قدمی کرنی چاہئے۔ جبتک اس معاملہ میں وہ پیش قدمی نہیں کریں گے مسلمان جہالت میں ڈوبا رہے گا اور مذہبی جنون کو مذہبی نیکی تصور کرتا رہیگا۔

جہاں تک اشفاق کی دوسری بات کا تعلق ہے کم از کم مجھے اس سے پوری طرح اتفاق تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ زندگی کے تئیں عام طرز فکر کی اصلاح کرنے اور ایک روشن خیال ذہن بنانے میں ہندو ناکام رہا ہے۔ ایسا کرنا تو دور رہا۔ بلکہ اس نے کچھ بری مثالیں قائم کی ہیں اور ملک کو برسوں پیچھے لے گیا ہے۔ تعلیم۔ سائنس اور ٹیکنولوجی کے میدان میں کافی ترقی ہونے کے باوجود ایک اوسط ہندوستانی اگر ۱۹۴۷ء کے زمانہ کے ہندوستانی سے جب تعلیمی آسانیاں نہیں کے برابر تھیں اس کا مقابلہ کیا جائے تو وہ آج بھی اس زمانہ سے کہیں زیادہ توہم پرست اور روایت پرست ہے وہ اب سنکھ و ناقوس کو مندروں کی چہار دیواری سے نکالکر سڑکوں پر لے آیا ہے اور منتروں اور بھجنوں کے ساتھ ان کو بجانا شروع کر دیا ہے۔ اگر ریزرو بینک آف انڈیا کا سنگ بنیاد وید منتر پڑھ کر اور پوری مذہبی رسومات کے ساتھ رکھا جاتا ہے تو آپ ایک غیر ہندو خاص طور پر مسلمان کو الزام نہیں دے سکتے اگر وہ ہر قومی تقریب کو ہندو تقریب کا نام دیتا ہے۔

اشفاق کے خیال میں اس پس منظر کے ساتھ مسلم عوام کا سیکولر ذہن بنانے اور ان کو قومی زندگی کے دھارے کے قریب لانے کی بات کرنا بے معنی ہے۔ اکثریتی طبقہ کا یہ طرز عمل قومی مفاد اور قومی اتحاد دونوں کے ہی خلاف ہے۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ ہم میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر ہمارے میزبان نے مشورہ دیا کہ ہمیں مزید بحث سے پہلے اشفاق کے خیالات پوری طرح سن لینے چاہئیں۔ اس لئے اب اشفاق نے پہلے اردو کا مسئلہ لیا۔ جب اشفاق نے کہا کہ ہندوستان میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں تو ہم ذرا چونکے۔ مگر جب انہوں نے مزید کہا کہ اردو کے ساتھ ہندی کی قسمت پر بھی مہر لگ گئی ہے تب ہم اور زیادہ پریشان اور حیران ہوئے۔ مگر اشفاق مضبوطی سے اپنی بات پر جمے رہے اور انہوں نے اپنے نقطہ نظر کو بڑی مضبوطی کے ساتھ دہرایا۔ ایک الہامی انسان کی طرح انہوں نے پیش گوئی کی کہ ہندوستان کا لسانی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا جبتک اردو کے بارے میں خاص طور پر اور دوسری علاقائی زبانوں کے بارے میں عام طور پر رویہ میں بنیادی تبدیلی نہیں لائی جائے گی۔ وہ بنیادی تبدیلی کیا ہو؟ کروپاندھی نے سوال کیا۔ آنکھیں بند کئے اشفاق نے اپنے ذہن کو اس سوال پر مرکوز کیا اور کہا کہ بجائے سیدھا اور مختصر جواب دینے کے وہ ذرا تفصیل سے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں انہوں نے اس طرح اپنے خیالات کی وضاحت کی:۔

"چند صوبوں میں اُردو کو ثانوی زبان تسلیم کرانے کی مانگ نے ایک سوال کھڑا کر دیا ہے جو اگرچہ وسیع تر لسانی مسئلہ کا حصّہ ہے مگر علیحدہ سے تجزیہ چاہتا ہے۔ اس صورت حال کے چند عوامل ذمہ دار ہیں۔ زبان کی حیثیت سے اردو کی اہمیت جس کی لاکھوں انسانوں نے آبیاری کی ہے۔ اس زبان کا مالدار ادب۔ ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت سے اس کا قریبی تعلق۔ اور ہندی اور ہندوستانی کی ترقی و تفریح میں اُردو کا ہاتھ —— جہاں یہ عوامل مستقبل میں اُردو کا

مقام متعین کرنے میں ایک سفارش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری طرف اس کے کاذ کے لئے سخت نقصان ده بھی ہیں۔

آج اُردو کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے مگر ایک بات یقینی ہے اردو کے حق کو ہمیشہ نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ یہ ایک زندہ زبان ہے۔ اور ہندی کی طرح ملک کے دور دراز حصّوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک بڑی اقلیت کی مادری زبان بھی ہے اور اس کا نظر انداز کیا جانا دستوری مسئلہ کو بھی کھڑا کر سکتا ہے —— اس کے علاوہ اردو ایک جاندار زبان ہے۔ اس میں توانائی اور لچک ہے۔ یہ خوبیاں ہندی میں نہیں ہیں اور ہندی کے بہی خواہ ان کو اردو سے حاصل کرنے کی امید رکھتے ہیں۔

اُردو مسئلہ کا ایک خطرناک پہلو یہ ہے کہ فرقہ وارانہ جذبات ابھارے بنا یہ سوال کبھی موضوع بحث نہیں بن سکتا ہے۔ اس حیثیت سے وسیع تر لسانی مسئلہ کے مقابلہ میں یہ سوال زیادہ خطرناک ہے۔ یہ ایک ایسا حساس اور نازک موضوع بن گیا ہے جو مستقبل قریب میں ایسی صورت حال پیدا کر سکتا ہے جس کا سامنا ہمیں ۱۹۴۷ء سے پہلے تھا۔

اس لئے سیاسی بصیرت اور قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ (الف) اس سوال کو بالائے طاق نہ رکھا جائے۔ اور اس کو حل کرنے میں لیت و لعل سے کام نہ لیا جائے۔

(ب) ہمیں اس مسئلہ کا کوئی منصفانہ اور عملی حل تلاش کرنا چاہئے۔

اس مسئلہ کو حل کرنے کی تجاویز پیش کرنے سے پہلے اس تنازعہ پر اثر انداز ہونے والے کچھ دوسرے حقائق کا بیان کرنا مفید ہوگا۔

۱۔ موجودہ ہندی اور اردو کے ادبی اسالیب جن سے آج ہم واقف ہیں وہ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ قدیم نہیں ہیں۔ دونوں کے اسالیب تین سو سال تک ایک دوسرے کے شانہ بشانہ

ترقی کرتے رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درجنوں ادیب جن میں ہندو و مسلمان دونوں شامل ہیں۔ دونوں زبانوں کی تاریخ کا حصہ ہیں اور جنکو اردو اور ہندی والے دونوں اپنا کہتے۔

۲- ہندی ادب کا قابل ذکر حصہ ہم تک ان مصنفین کے ذریعہ پہونچا ہے جو اپنی تصانیف کے لئے غیر دیوناگری رسم الخط استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر صوفی شاعروں کی پوری جماعت نے اپنی اودھی تصانیف کے لئے فارسی رسم الخط اختیار کیا۔ اسی طرح پنجاب میں بہت سے برج بھاشا کے شاعروں نے گورمکھی رسم الخط اپنایا۔ اور اسی طرح میتھلی کے ہندی ادیب کیتھی رسم الخط استعمال کرتے رہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ زبان ہی بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ رسم الخط ثانوی درجہ رکھتا ہے۔

۳- ہندوستانی۔ جو اردو اور ہندی کا مشترکہ نام ہے۔ فوجیوں اور دوسرے سول افسروں کو سالوں تک رومن رسم الخط میں سکھائی جاتی رہی۔ اور کہا جاتا ہے کہ جو مہارت انہوں نے اس زبان میں رومن رسم الخط کے ذریعہ حاصل کی وہ اسی درجہ کی تھی جو وہ دیوناگری رسم الخط کے ذریعہ پیدا کرتے تھے۔ آج بھی پورے ملک میں فوجی جوانوں کی تربیت کا ذریعہ رومن ہندی ہی ہے۔

۴- علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں ہندی کو رومن رسم الخط میں سکھانے کے انتظام کی تجویز ہے یہی ایک عملی راستہ ہے جس کے ذریعہ ایسی جگہ میں نوجوانوں کو ہندی سے خوفزدہ کئے بغیر ہندی سکھائی جا سکتی ہے۔

۵- یوپی۔ بہار۔ مدھیہ پردیش کے مختلف حصوں میں عیسائی مشنری اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے لکھنے اور پڑھنے کے مقاصد کے لئے دوسرے رسم الخطوں کے مقابلہ میں رومن رسم الخط کا ہی زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

۶۔ نیفا۔ ناگالینڈ۔ اور دوسرے پہاڑی قبائلی علاقوں میں ہندی تدریسی اسکیم کی مقبولیت ہندی کو رومن رسم الخط میں سکھائے جانے کی مرہون منت ہے۔ اسی طرح کونکن میں کوکنی زبان کیلئے رومن رسم الخط کا استعمال اسی قدر مقبول ہے جس قدر دوسرے رسم الخط۔"

جب ہم نے اشفاق کو ٹھوس و واضح تجاویز پیش کرنے کے لئے مجبور کیا تو انہوں نے مندرجہ ذیل باتیں ہمارے سامنے رکھیں:۔

۱۔ "میری تجویز ہے کہ زبان کے وسیع تر مسئلہ کو چھیڑے بنا سرکاری زبان کو جو کہ ہندی ہے رومن رسم الخط میں لکھا جائے۔ ابتدائی دور میں اس رسم الخط کا استعمال صرف سرکاری کاموں تک محدود رکھا جائے۔

۲۔ اس سے سرکاری دفتروں میں ہندی کے استعمال کی ہمت افزائی ہوگی۔ ہندی ٹائپ رائٹر مہیا کرنے کی مصیبت سے چھٹکارا ملے گا۔ انگریزی کے ٹائپ رائٹر بدلے بغیر ہی سرکاری ملازمین ہندی میں ٹائپ کرسکیں گے۔

۳۔ سرکاری ہندی کا جب رومن رسم الخط میں لکھنے کا انتظام ہو جائے گا تو اردو کے حامیوں کی اردو کو تسلیم کرانے کی مانگ خود بخود پوری ہو جائے گی۔ ایک دفعہ جہاں ہندی دیوناگری رسم الخط سے باہر آئی۔ لازمی طور پر اس میں دوسری زبانوں خاص طور پر اردو کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال ہوں گے۔ اور جب یہ سلسلہ شروع ہوگا تو اردو والے فارسی رسم الخط پر رومن رسم الخط کو ہی ترجیح دیں گے۔ جس کا مطلب ہوگا اردو کو تسلیم کرنا۔ اس طرح کا قدم اُردو والوں کے لئے احتجاج و شکایت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑیگا۔

۴۔ ہندی اور اردو اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گی۔ اور وہ ایک زبان بن جائیں گی اس زبان کو ہم ہندی کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح اس زبان کا دامن اور زیادہ وسیع ہو جائیگا۔

وہ زیادہ جاندار اور مالدار زبان بن جائے گی۔ اور صحیح معنوں میں ہندی ملک گیر قومی زبان بن سکے گی۔

۵۔ اس تجویز کی سب سے زیادہ معنی خیز خصوصیت یہ ہے کہ طباعت واشاعت اور ٹائپنگ وغیرہ کے میکانکی عمل میں ہندی ایک جدید زبان بن جائے گی۔ اس پر سے دور وسطیٰ کی زبان ہونے کا الزام ختم ہو جائے گا۔ اس وقت غیر ہندی والوں کے لئے اس کا سیکھنا آسان ہوگا۔ اور اس سے بھی آسان اس کا سرکاری محکموں میں سرکاری کاموں کے لئے استعمال ہوگا۔

۶۔ یہ قدم تعلیم ولسانیات کے میدان میں ایک خاموش انقلاب کو جنم دے گا۔ یہ دوسری زبانوں کو رومن رسم الخط کی طرف راغب کرنے کے لئے ایک مثال بن جائے گا۔ اس سے مستقبل میں ایک رابطہ کی زبان کے لئے راہ ہموار ہو سکے گی جب ایک دفعہ ہندوستان کی تمام زبانیں ایک ہی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں گی تو دوری۔ جہالت۔ تعصبات کی بہت سی دیواریں خود بخود گر جائیں گی اور صوبوں اور لسانی علاقوں میں ایک مثبتی طرز فکر اختیار کیا جائے گا۔ اس کا مطلب اس میدان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔

۷۔ آخر میں۔ جوں ہی سرکاری ہندی کے رومن رسم الخط میں استعمال کا آغاز ہوگا۔ اردو بھی رومن رسم الخط میں تسلیم کر لی جائے گی۔ دیر سویر ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی یہی راہ اپنائیں گی اس سے نہ صرف ہماری زبانوں میں ایک انقلاب آئے گا بلکہ ہمارے ذہن بھی بدلیں گے۔ زبان کے مسئلہ کی بھول بھلیوں سے نکلنے کا یہ ایک بہترین راستہ ہے۔"

آخر کار زبان کے مسئلہ پر اشفاق کے نظریات زیادہ حیرانی کا باعث نہیں بنے۔ سوائے ایک کے ہم سب نے اشفاق کی اس بات سے اتفاق کیا کہ ۱۹۴۹ء میں ہندوستانی کو رومن رسم الخط

میں اپنانے کی بجائے ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں اپنا کر بڑی غلطی کی گئی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ اشفاق وزیر تعلیم مولانا آزاد کے خیالات کی ترجمانی کر رہے تھے اگرچہ انہوں نے یہ بات واضح طور پر تسلیم نہیں کی۔ انہوں نے صرف اسقدر کہا کہ جہاں تک وہ جانتے ہیں زبان کے مسئلہ پر مولانا آزاد کے بھی اسی طرح کے خیالات ہیں اشفاق نے اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ تبلائی کہ مولانا آزاد کے بہت سے ساتھی اس معاملہ میں ان کے نظریات کے ہمنوا تھے۔ مگر ان میں اپنے خیالات کو عوام کے سامنے ظاہر کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ میں نے جب سوال کیا کہ آخر مولانا آزاد نے خود کیوں ان خیالات کا اظہار نہیں کیا تو اشفاق نے جواب دیا کہ مولانا کا خیال تھا کہ ان نظریات کے اظہار کا ابھی وقت نہیں آیا۔ وہ اگر اپنے نظریات ظاہر کریں گے تو اس سے بجائے فائدہ پہونچنے کے لوگوں کے ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوں گے اور بہرحال یہ نظریات دستور ہند کی دفعات کے بھی منافی تھے۔

چونکہ اب کچھ دوست اشفاق کے ساتھ دوسرے سوال پر بحث کرنا چاہتے تھے جو انہوں نے ابتدا میں اٹھایا تھا گفتگو کا رخ سیکولرازم اور سرکاری تقریبات کے موقع پر ہندو رسم ورواج اپنانے کے موضوع کی طرف پھیر دیا گیا۔ میزبان محترم نے اس معاملہ کی بڑے غیر جذباتی طریقہ اور غیر جانبداری سے وضاحت کی۔ انہوں نے کہا چونکہ صدیوں سے زندگی کا تہذیبی پہلو کسی قوم کا فطری جبلتوں کے تئیں اجتماعی ردعمل رہا ہے۔ اس لئے یہ ہماری موجودہ سوسائٹی کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ یہ اجتماعی ردعمل فطری طور پر کسی قوم کے تجربات۔ امیدوں وتمناؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ ہندوستان کے معاملہ میں چونکہ یہاں کے زیادہ تر باشندے ہزاروں سال سے ہندو طرز زندگی پر عمل پیرا رہے ہیں اس لئے ان کے تجربات ورجحانات میں بھی ہندوانہ رنگ کی آمیزش ہے۔ اور سرکاری وغیر سرکاری عوامی تقریبات کے موقعوں پر اس ہندو ذہن کا مظاہرہ فرقہ پرستی

نہیں کہلا سکتا ہے۔ یہ مظاہر حقیقت میں ہندوستانی ہیں۔

اس نازک مسئلہ کی اتنی صاف ستھری وضاحت پر ہم نے اپنے میزبان کو خراج تحسین پیش کیا۔ یہاں تک کہ اشفاق نے بھی اقرار کیا کہ جو کچھ کہا گیا وہ صحیح ہے۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھے اور کہا کہ ہندوستان میں مسلم دور حکومت سے پہلے کی تمام روایات میں ہندو تہذیب و مذہب کی رنگ آمیزی ہے اس لئے ان سب کو فرقہ وارانہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہم سب نے اس بات سے بھی اتفاق کیا کہ ہمارے ملک کی تمام تر روایات و رسومات ہماری تاریخ اور آب و ہوا کی پیداوار ہیں۔ ان کا کسی خاص طبقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ آیا یہ کبھی ممکن ہو سکے گا کہ ہم اس معاملہ کو اس روشنی میں عوام تک پہونچا سکیں جس روشنی میں ہم نے اس پر ابھی بحث کی ہے۔ یہ ممکن ہو یا نہ ہو مگر اس بات پر ہم سب ہی کا اتفاق تھا جو نظریہ اپنایا گیا وہ درست۔ صحت منداور عقلی تھا۔

●●

(۳۴)

زبان — ایک دشوار مسئلہ

یہ مضامین ہندوستان ٹائمز اور ٹریبون جیسے چند مشہور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے ان کو پرشوتم داس ٹنڈن کی خواہش پر لکھا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ غیر ہندی زبانیں بولنے والے طبقوں کا خوف دور کیا جائے اور ایک معقول دلیل کے ساتھ ہندی کو تسلیم کرایا جائے۔ اس سال (۱۹۵۸) پارلیمنٹ اور ملک گیر سیاسی حلقوں میں جو زبان کے مسئلہ پر ایک ناخوشگوار بحث چھڑ گئی ہے اس کے پیش نظر ایسا کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔

مصنف کی بدقسمتی سے ٹنڈن جی نے اس طرز فکر کو پسند نہیں کیا جو ان مضامین میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سال جون میں جب مصنف الٰہ آباد ان کے گھر پر ملنے گیا تو انہوں نے صاف طور پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔ مصنف کو اس پر بڑا دکھ بھی ہوا اور شرمندگی بھی کیونکہ اس وقت ٹنڈن جی بیمار تھے اور بستر تک محدود تھے۔

اس وقت سے مصنف نے ان مضامین کو کئی بار پڑھا ہے۔ ہر بار کے مطالعہ سے اس کا یقین پختہ ہوا ہے کہ ان مضامین میں خاص طور پر تیسرے مضمون میں جو ٹنڈن جی کو سب سے زیادہ ناگوار گذرا تھا جو نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ صرف قابل عمل ہی نہیں۔ بلکہ ناگزیر بھی ہے۔ کیونکہ بہر حال زبان کے مسئلہ کا متفقہ حل اسی بات پر تو منحصر ہے کہ ہم اس کو کتنی جلدی عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔

اگر آزادی کی یہ دلنواز خصوصیت ہے کہ اس کی آمد سے اصول ایک ہی رات میں ثابت شدہ حقیقتوں میں بدل جاتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی ہوتا ہے کہ ثابت شدہ حقائق اپنی صداقت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ اکثر ہوا ہے کہ کسی ملک کی آزادی کے موقع پر پہلی خوشی کی لہر کے بعد ہی بہت سے ایسے مسائل سر اٹھاتے ہیں جن کے بارے میں جد و جہد آزادی کے دوران سوچا جاتا تھا کہ وہ طے شدہ معاملات ہیں۔ یا کم از کم وہ جھگڑے کا موضوع نہیں بنیں گے۔

ہندوستان کا لسانی مسئلہ اس نوعیت کا ایک واقعہ ہے۔ جنگ آزادی کے دوران ایک قومی زبان کی ضرورت کو سبھی محسوس کرتے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اس سلسلہ میں ایک قدم آگے بڑھایا اور اپنی کارروائیوں اور روزمرہ کاموں کے لئے انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی یا ہندوستانی کو بھی استعمال کرنا شروع کیا۔ مہاتما گاندھی نے جو کانگریس کے ممتاز ترین لیڈر تھے۔ اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی غیر ہندی علاقوں میں ہندی کے پرچار کو بڑی اہمیت دی تھی۔ انہوں نے کبھی اس بارے میں شک نہیں کیا کہ کسی نہ کسی شکل میں جب بھی تبدیلی کا وقت آئے گا ملک گیر سطح پر ہندی ہی انگریزی کی فطری و لازمی جانشین بنے گی۔ یہ معقول عقیدہ کہ ہندی ہی ملک کی قومی زبان ہو اس قدر گہری جڑیں پکڑ چکا تھا کہ دستور ساز اسمبلی نے اس عقیدہ کو دستور میں شامل کر کے عملی روپ دیا۔ یہ فیصلہ کچھ بحث و مباحثہ تبادلۂ خیالات اور قربانی کی اسپرٹ کو اپنانے کے بعد کیا گیا۔

جنوب اور دوسرے غیر ہندی علاقوں کے رہنماؤں نے ۱۹۴۹ء میں قانون ساز اسمبلی میں اور اس سے باہر ہندی کو قومی زبان بنانے والوں کا ساتھ دیکر اور اس کے حق میں اپنے خیالات کا اظہار کر کے ثابت کر دیا کہ ان کے نزدیک قومی مفاد سب تقاضوں سے بالاتر ہے۔ تمام علاقوں اور طبقوں کے نمائندوں نے قانون ساز اسمبلی کی بحث میں حصہ لیا اور اس بحث کے دوران سب نے بلا جھجک اپنے شکوک و شبہات امیدوں و تمناؤں۔ خوف و ڈر کا اظہار کیا۔ تاکہ ممبران اسمبلی اپنی حقیقی اور دلی رائے کا اظہار آزادی سے

کر سکیں اس لئے کانگریس نے اپنے تمام ممبروں کو مکمل آزادی دیدی تھی کہ وہ جو چاہیں کہیں اور جس طرح چاہیں اپنے ووٹ کا استعمال کریں۔ اسی لئے پہلے سے پارٹی کی طرف سے (WHIP) ہدایت نامہ بھی جاری نہیں کیا گیا آزادی اور بہترین جمہوری روایات کے ماحول میں بحث عمل میں آئی۔

جب دستور کی دفعہ ۳۴۳ کو دستور ساز اسمبلی نے منظور کر لیا۔ پوری دنیا نے ہندوستان کی تعریف کی۔ ہندوستان میں رہنے والے بہت سے غیر ملکیوں اور باہری دنیا کے لوگوں کو یہ یقین نہیں تھا کہ اسمبلی لسانی مسئلہ کا کوئی متفقہ حل نکال لے گی۔ لیکن کسی نہ کسی طرح ہمارے قابل قدر رہنماؤں نے تمام حلقوں کو اس بات پر آمادہ کر ہی لیا کہ ہندی دیوناگری رسم الخط میں قومی زبان ہوگی۔ اور پندرہ سال کی مدت گذرنے پر وہ ملک گیر پیمانہ پر انگریزی کی جگہ لے لیگی۔

جب ہم پیچھے کی طرف مڑکر دستور ساز اسمبلی کی بحثوں کی کارروائیوں کے اوراق الٹ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریات جنکا اظہار آج غیر ہندی علاقوں کے لیڈر کر رہے ہیں ان خیالات و نظریات کے قطعی برعکس ہیں جن کا اظہار قانون ساز اسمبلی میں کیا گیا تھا۔ سب سے زیادہ قابل حیرت یہ امر ہے کہ ۱۹۴۹ء میں ایک قومی زبان کا انتظام قومی اتحاد کے لئے لازمی سمجھا گیا تھا جبکہ آج ۱۹۵۷ء و ۱۹۵۸ء میں ہندی کو انگریزی کی جگہ لینے کی بات کی جاتی ہے تو وہ قومی اتحاد کے لئے خطرہ بن جاتی ہے۔ شری راجگوپال اچاریہ اور دوسرے جنوبی ہند کے رہنما ملک کے اتحاد کے نام پر انگریزی کو برقرار رکھنے کی وکالت کر رہے ہیں ان کو ڈر ہے کہ اگر کبھی بھی اور کسی بھی شکل میں ہندی کو انگریزی کی جگہ دی تو ملک کا اتحاد خطرہ میں پڑ جائے گا۔

حقائق کے اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہے کہ ان پچھلے نو سالوں میں کچھ باتیں ایسی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے کچھ ذمہ دار لیڈر بھی اپنی رائے میں تبدیلی کرنے پر مجبور ہوئے ہیں ان لیڈروں کی نیک نیتی پر شک وشبہ کرتے ہوئے لسانی تنازعہ کے تجزیہ کا آغاز کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ ہم

معاملہ کی گہرائی تک پہونچنے کی کوشش کریں اور موجودہ بےچینی کو کچھ عوامل کا نتیجہ سمجھیں نہ کہ ہندی کے خلاف جہاد۔ ہندی سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کرتے ہوئے ہمیں پہلے اس سوال کو ایک آزاد قوم کی ضروریات کے نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے ان میں سے ایک ضرورت قومی زبان بھی ہے۔

عملی سیاست کے میدان میں کوئی نظریہ اور کوئی اصول مقدس نہیں سمجھا جاتا۔ اور قومی زبان کا مسئلہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ایک مشترکہ ذریعہ اظہار خیال بذات خود عوام یا قوم کی ایک بڑی ضرورت ہے۔ اگر دنیا کے مختلف خطوں کے رہنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا ہے۔ تب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس مقصد کو جلد اور کامیابی کے ساتھ حاصل کرنے کے لئے ایک ایسی زبان کا ہونا ضروری ہے جو تمام دنیا کے لوگ سمجھ اور بول سکتے ہوں۔ ایک قوم دنیا کی آبادی ہی کا ایک چھوٹا گروپ ہے اس لئے جو بات دنیا کے لئے صحیح ہے اس کو ایک قوم کے لئے بھی مفید سمجھا جائے گا۔ یہ کہنا خاص طور پر ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے درست ہوگا جہاں صدیوں کے دوران بہت سی زبانیں وجود میں آگئی ہیں۔ یہ زبانیں نہ صرف پوری طرح فروغ پائی ہوئی ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک ایسی ہے جنکے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں نہیں تو لاکھوں میں ضرور ہے۔

خصوصی طور پر ذکر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان جیسے ملک کے لئے ایک قومی زبان چھوٹے پیمانہ پر وہی مقصد پورا کر سکتی ہے جو ایک عالمگیر زبان سے دنیا کے لئے حاصل ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی نظام حکومت وفاقی نوعیت کا ہے۔ یہاں تک کہ ریاستوں میں بھی طاقت کی تقسیم پر زور دیا جاتا ہے صرف اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ طاقت کی یہ تقسیم کام میں رکاوٹ نہ بنے اور سرکاری اداروں کے باہمی تعاون کو منتشر نہ کرے یہ حقیقت جہاں ایک طرف علاقائی زبانوں کی اہمیت کا تقاضہ کرتی ہے تو دوسری طرف ایک ملک گیر زبان کی ضرورت کو بھی جتلاتی ہے یہ ایک ایسی زبان ہو جو مختلف علاقوں کے درمیان رابطہ کا کام انجام دے سکے۔ ایک ایسی زبان کی عدم موجودگی میں جس کو کم از کم ریاستوں

کے اعلیٰ ملازمین سمجھ سکتے ہوں۔ یہ تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ ایک طرف خود ریاستوں کے درمیان اور دوسری طرف ریاستوں اور مرکز کے درمیان کوئی ہم آہنگی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ایک مشترکہ زبان انسانی طاقت اور دوسرے قومی وسائل کو مختلف شعبہ ہائے زندگی خاص طور پر قومی اور ملکی اہمیت کے شعبوں میں جٹانے کیلئے لازمی شرط ہے۔

شاید یہ بات آسان معلوم ہو اور اسی لئے اس کی تعریف نہ کی جائے۔ لیکن بہر حال یہ ایک حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جو انگریزی کے وجود اور اس کے دو سو سال تک سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے دھندلی پڑ گئی ہے۔ اس ملک میں انگریزوں کی آمد سے پہلے۔ ہندوستان مجموعی اعتبار سے کبھی ایک انتظامیہ کے ماتحت نہیں آیا تھا۔ اس لئے ماضی سے مثالیں تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور نہ ان مثالوں کا آج کے حالات پر اطلاق ہی ہو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک مشترکہ زبان کی اہمیت ایک تسلیم شدہ امر ہے کبھی کبھی دو یا دو سے زیادہ قومی زبانوں کے حق میں دلیلیں دی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں کینڈا اور سوئزرلینڈ کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ مگر ان مثالوں کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے حالات ان ملکوں کے حالات سے قطعی مختلف ہیں۔ ہندوستان میں اصل سوال یہ ہے کہ کونسی زبان کو قومی زبان کا جامہ زیب تن کرنا چاہئے۔ کیا یہ زبان ہندی دیوناگری رسم الخط میں ہو جیسا کہ نو سال پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی نے فیصلہ کر دیا ہے یا یہ زبان انگریزی ہو جس کی کہ ہمارے جنوبی اور مشرقی ہند کے کچھ رہنما وکالت کرتے ہیں۔ ہم ذرا تفصیل سے ان سوالات پر بحث کریں گے۔

۲۔ انگریزی کا معاملہ

ہم نے ایک قومی زبان کی ضرورت کو ابھی سمجھا ہے۔ اب ہمیں ان شبہات کا تجزیہ کرنا ہے جو

پچھلے دنوں کچھ ذہنوں میں ہندی کے بارے میں پیدا ہو گئے ہیں۔ مبصرین نے خاص طور پر دو طریقوں کو پسند کیا ہے۔ اولاً انگریزی کو ان کاموں کے لئے برقرار رکھا جائے جو وہ ابتک انجام دے رہی ہے۔ دوئم کسی ایک ہندوستانی زبان کو اپنایا جائے جو آخر کار انگریزی کی جگہ لے لے ان دونوں طریقوں کے نتائج کچھ بھی ہوں۔ لیکن یہ قطعی صاف ہے کہ یہ طریقے نہ دور از عمل ہیں اور نہ غیر منطقی ہی۔ دراصل ان طریقوں کو مناسب طریقہ سے سمجھنا ہی موجودہ لسانی مسئلہ کو حل کرنے میں ہماری مدد کر سکتا ہے کیونکہ مسئلہ کی اصل جڑ یہی دو باتیں ہیں۔

انگریزی کو برقرار رکھنے کی وکالت کے خلاف اب بلا شبہ کم احتجاج پایا جاتا ہے یہ کوئی غلط بات نہیں ہے بشرطیکہ یہ حل قابل عمل ہو اور اس مسئلہ کا بہترین حل مانا جا سکے۔ اس معاملہ کے حقائق یہ ہیں کہ انگریزی زبان ہمارے مزاج کے لئے قطعی ایک غیر ملکی زبان ہے اور اس کو ہندوستان کی آبادی کا صرف ایک فیصد حصہ ہی سمجھتا ہے۔ آزادی نے جن قوتوں کو جنم دیا ہے ان کے پیش نظر انگریزی کو عوام میں اس لئے مقبول نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان کے لئے مفید ہو گی۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے آج تک انگریزی کے معیار اور اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں کمی ہوئی ہے یہ ایک عجیب متضاد صورت حال ہے کہ ایک طرف ابتک جو سیاسی لیڈر اس کے مخالف تھے اب انگریزی سے چپکے رہنے میں فائدوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف ہندوستانی عوام مجموعی اعتبار سے انگریزی کے لئے اپنا جوش و دلچسپی ختم کر چکے ہیں۔ اس لئے اب یہ قطعی مشکل نظر آرہا ہے کہ کوئی بھی ہندوستانی سرکار انگریزی کو ایک بار پھر اس کی سابق پوزیشن پر برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائے گی کیونکہ اب تمام مدارج میں تعلیم و تدریس کے لئے ہندوستانی زبانیں اختیار کی جا چکی ہیں۔

اس کے علاوہ۔ کیا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ حیثیت میں انگریزی کا برقرار رکھنا ہمارے قومی مفادات کو بہتر طریقے سے پورا کر سکتا ہے ؟ کیا ہم مثال کے طور پر انگریزی کی موجودہ برتری کو

قائم رکھتے ہوئے اپنی زبانوں اور ان کے ادب کو فروغ دے سکتے ہیں؟ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ زیادہ تر مغربی خیالات اور سائنسی علوم ہم نے انگریزی کے ذریعہ حاصل کئے ہیں، کیا ہم حق بجانب ہوں گے کہ ان علوم وفنون کی تحصیل کو صرف اسی طبقہ تک محدود رکھیں جو انگریزی یافتہ ہو۔ اور ملک کی غیر معمولی اکثریت کو ان علوم سے محروم رکھیں۔ کیا ہم اپنی موجودہ خواندگی اور ذہنی نشو ونما سے مطمئن ہیں؟ اور کیا ہم اپنے وسائل اور قوتوں کو انگریزی کو پچاس کروڑ انسانوں کی قومی زبان بنانے پر ضائع کرتے رہیں گے؟ یہ تصور ہی اسقدر مضحکہ خیز ہے کہ مغربی دنیا کی انگریزی بولنے والی قومیں بھی ہم پر ہنسنے لگیں۔

ایک اور پہلو جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ قومی خودی یا قومیت کے احساس کا ہے۔ یہ پہلو قومی زبان کے سلسلہ میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی حالیہ تقریروں اور پارلیمنٹ میں کئے گئے سوالوں کے ان کے جوابات سے منظر عام پر آیا ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ غیر ملکی معاملات میں ایک غیر ملکی زبان (انگریزی) کے استعمال کی ناخوشگواری کو سب سے پہلے وزارت امور خارجہ نے محسوس کیا۔ جبکہ دوسرے ملکوں کے نمائندے اپنی اپنی قومی زبانوں میں بات کرتے ہیں۔ اپنی قومی زبان نہ استعمال کر کے ہم ان کی نظروں میں حقیر ہوئے بنا نہیں رہ سکتے اس طرح ہم اپنی قومی زبان کے وقار کو خطرہ میں ڈالدیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وزارت امور خارجہ نے اپنی وزارت میں پہلے ہندی زبان کو کافی اہمیت دی ہے تاکہ خط وکتابت. مبارکبادی کے پیغامات معاہدوں اور دستاویزوں پر دستخط وغیرہ جیسے کام ہندی زبان میں ہی تکمیل پا سکیں۔

ایسی صورت حال میں کیا یہ امر قابل حیرت نہیں ہے کہ ملک میں ایک قابل اثر طبقہ نے نہ صرف انگریزی کو برقرار رکھنے کی تجویز پیش کی ہے بلکہ اس کے لئے باقاعدہ مہم کا آغاز کر دیا ہے؟ تاہم یہ بات ان لوگوں کے لئے حیرانی کا باعث نہیں ہے جو موجودہ بحث اور دستور کے نافذ ہونے کے بعد ظہور میں آنے والے واقعات کے پس منظر سے واقف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی کو برقرار رکھنے کی تجویز کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس زبان کا معیار بہت بلند ہے بلکہ اس کی اصل وجہ ہے کہ دستور کی شرائط کے مطابق ہندی کو انگریزی کی

جگہ دینے میں پیچیدہ دشواریاں ——— خیالی یا حقیقی ——— درپیش ہیں۔

ہندی اسی ملک کی زبان ہے اور اس کی جڑیں یہاں کی سرزمین میں کافی گہری گڑی ہوئی ہیں۔ اس زبان میں اور دوسری علاقائی زبانوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غیر ہندی علاقوں کے رہنے والوں کے لئے ہندی کا سیکھنا اگر مصیبت نہیں تو کم از کم باعث محنت و کاوش تو ضرور ہے۔ اور نہ اس بات ہی سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ طے شدہ موجودہ اسکیم میں ہندی کو قومی زبان کا درجہ دینے سے ان لوگوں کو ہندی جنکی مادری زبان ہے خاص فائدہ نہیں پہونچے گا۔ غیر ہندی علاقوں کے رہنے والوں کی مشکلات کو کم کرنا۔ اسی کے ساتھ سب کو برابر مواقع فراہم کرنا اور ہندی کی ترقی و ترویج کی حوصلہ افزائی کرنا۔ زبان کے بارے میں ان دہرے مقاصد کو حاصل کرنا ہی پچھلے سالوں میں حکومت کی پالیسی رہی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ متذکرہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جو کچھ کیا گیا ہے وہ عوام کی توقعات اور ضروریات سے بہت کم ہے۔ مختصراً یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے یہ مطالبہ سامنے آیا کہ موجودہ پوزیشن (STATUS QUO) کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ زبان کے مسئلہ کا یہی کلیدی نکتہ ہے۔ اگر ہم اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس کی گہرائی تک جانا چاہتے ہیں تو ہمیں متذکرہ بالا حقائق کو نظر میں رکھنا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں ہندی کی ماہیت و پوزیشن اور اس زبان کو مقبول بنانے کا طریقہ اس تنازعہ کا باعث ہے نہ کہ مفروضہ انگریزی زبان کی اہمیت اور معیار۔

اس سے ہمیں سوال کا صحیح جواب پانے میں مدد ملتی ہے۔ کیا ہماری ایک قومی زبان ہونی چاہئیے؟ بلا شبہ اس سے سب کو اتفاق ہے کہ ایک قومی زبان کا ہونا ضروری ہے۔ بشرطیکہ ہندی کا مفاد علاقائی زبانوں کے مفاد کو ضرب نہ پہونچائے اور ہندی بولنے والے علاقوں کو نسبتاً زیادہ فائدہ نہ پہونچائے۔ آیا اس قسم کے شکوک و شبہات صحیح ہیں یا غلط یہ ایک دوسری

بات ہے۔ صرف شک و شبہ کے عنصر کی موجودگی ہی اس بات کے لئے مجبور کرتی ہے کہ تمام محب وطن ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندی زبان کے حامیوں کو پوری سنجیدگی و خلوص کے ساتھ اپنے کو اس مسئلہ کے حل پر لگا دینا چاہیئے اور اس خوف کو دور کرنے کے لئے مسئلہ کی گہرائی تک پہونچنا چاہیئے۔

۲- انگریزی کو ہٹانے کی راہ میں مشکلات

چونکہ موجودہ زبان کے جھگڑے کی جڑ وہ دشواریاں ہیں جو ہندی کو دستور کی دفعہ ۳۴۳ کے مطابق ایک آل انڈیا زبان بنانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور انگریزی زبان کی اپنی خصوصیات کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لئے غیر جانب داری کے ساتھ ان دشواریوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ان دشواریوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اولاً وہ دشواریاں ہیں جو ہندی کے اپنے مزاج اور اس کے رسم الخط کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ دوئم علاقائی زبانوں کی اپنی پوزیشن اور اپنے مطالبات ہیں ہندی کی ترویج و ترقی سے ان پر اثر انداز ہونے والے امکانات اور غیر ہندی زبانیں بولنے والوں کو ہندی زبان سیکھنے میں در پیش مشکلات بھی ہیں۔

ہندی زبان کی اپنی بہت سی کمیاں و خامیاں ہیں۔ خاص طور پر جب اس کا مقابلہ انگریزی جیسی ترقی یافتہ زبان سے کیا جائے۔ مگر ہم ان کمیوں کا ذکر بعد میں کریں گے۔ ہمیں پہلے ان مشکلات کا جائزہ لینا چاہیئے جو علاقائی زبانیں بولنے والوں کو در پیش ہیں۔ انہیں اپنی مادری زبان کے علاوہ ایک طرف تو ہندی سیکھنی ہے، جو ایک دن ملک گیر زبان ہونے جا رہی ہے۔ دوسری طرف انگریزی زبان کی تعلیم کو بھی جاری رکھنا ہے۔ کیونکہ بہر حال اس کو سیکھنا بین الاقوامی روابط قائم رکھنے اور فنی و تکنیکی علوم کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ اس معاملہ کے محض بیان سے ہی انداز

ہو جاتا ہے کہ ہندی بولنے والوں کے سامنے کس قدر مواقع ہیں اور غیر ہندی والوں کے کاندھوں پر کتنا بوجھ ہے۔ غیر ہندی علاقہ کے ایک طالب علم کو اوسط درجہ کی استعداد پیدا کرنے کے لئے تین زبانوں ——— اپنی مادری زبان۔ ہندی اور انگریزی ——— میں مہارت حاصل کرنی ہوگی۔ وہ جنکی مادری زبان ہندی ہے انہیں صرف انگریزی زبان ہی سیکھنی ہے۔

کسی بھی دلیل سے اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ واقعی یہ ایک بوجھ اور دشواری ہے۔ چاہے یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ہمارے جنوبی ہند کے بھائی اور دوسرے غیر ہندی علاقوں کے لوگ اس کمی کو پورا کر لیں گے یہ بات نہیں ہے کہ ان میں دوسری زبانیں سیکھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ سوال ہندوستانی ہندوستانی کے درمیان بوجھ کی غیر مساوی تقسیم کا ہے۔ دوسرے اور بہت سے اسباب کے علاوہ غالباً یہ بھی ایک وجہ ہے کہ حال ہی میں کچھ لوگ ہندی کے مقابلہ میں سنسکرت کو ایک ملک گیر زبان بنانے کی وکالت کرنے لگے ہیں۔ مسئلہ کے اس پہلو سے عوام اور حکومت بخوبی واقف ہیں۔ مگر بدقسمتی سے غیر ہندی علاقوں کے لوگوں اور علاقائی زبانوں کے حامیوں کے شکوک و شبہات دور کرنے کے لئے کوئی قابل ذکر قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔

پچھلے تین چار سال سے مرکزی وزارت تعلیم اور مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ ہندی علاقوں میں علاقائی زبانوں کو فروغ دینے و مقبول بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس طرح غیر ہندی علاقوں میں ہندی کا مطالعہ لازمی قرار دیا گیا ہے اسی طرح ہندی بولنے والے علاقوں میں کسی ایک علاقائی زبان کا مطالعہ لازمی قرار دیا جانا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ چند صوبوں نے اس تجویز کو تسلیم کر لیا ہے۔ مگر کچھ ابھی علاقائی زبانوں کو لازمی بنا دینے کی تجویز کی مخالفت کر رہے ہیں۔

حالیہ پنجاب میں ہوا احتجاج اس بدنما صورت حال کو منظر عام پر لے آیا ہے اس دستانی

صوبہ میں ہندی علاقوں کے لیڈروں نے پنجابی زبان کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائے جانے کے خلاف ناقابل مفاہمت نظریہ کا اظہار کیا ہے۔ جب ایک ایسی ریاست جہاں یہ دونوں زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں وہاں ہندی کے نمائندے اسقدر غیر معقولیت کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے اسکولوں میں پنجابی زبان کو پڑھانے کے لئے تیار نہیں۔ تب ملک کے دوسرے حصّوں میں ہندی کے حامیوں کا رویہ کس طرح مصالحت پسندانہ اور معقول ہو سکتا ہے ۔ اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مرکزی حکومت کو فیصلہ دیدینا چاہئے کہ ہندی علاقوں میں علاقائی زبان کی تعلیم لازمی ہوگی۔ اگرچہ اس سمت میں کچھ کوشش بھی کی گئی ہے مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے پنجاب یں ہندی کے حامی اس حقیقت کو محسوس نہیں کرتے ہیں کہ جب وہ اپنے بچوں کے لئے کسی دوسری زبان کو لازمی طور پر پڑھایا جانا تکلیف دہ سمجھتے ہیں تب ہم کس منہ سے ملک کی نصف آبادی کیلئے جو ہندی نہیں بولتی ہندی کی لازمی تعلیم کی سفارش کر سکتے ہیں۔

تنگ نظری کی یہ ایک مثال ہے جس کے نتائج سارے ملک پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اسی طرح کی مثالوں اور ان کے پیچھے کام کرنے والے اسی تنگ ذہن نے غیر ہندی علاقوں کا رویّہ ہندی کے خلاف سخت بنا دیا ہے۔ تنازعہ کا ایک اور امکانی سبب ہندی کا دوسری علاقائی زبانوں کے ساتھ موازنہ کرنا ہے۔ ایک زبان کی ادبی صلاحیت ہی ہمیشہ اس کی بڑائی کا معیار بن سکتی ہے اگرچہ ہندی ذریعہ اظہار خیال اور ادب کی حیثیت سے تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے ۔ مگر دوسری علاقائی زبانوں کے حامی ہندی کے مرتبہ کو چند دوسری علاقائی زبانوں کے مرتبہ سے موازنہ کرنے کے قابل نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندی زبان میں لغات۔ انسائیکلوپیڈیا۔ کتب حوالاجات (REFERENCE BOOKS) وغیرہ کی کمی ہے جبکہ چند دوسری علاقائی زبانیں اس طرح کی کتابوں سے مالا مال ہیں۔ جب یہ دلیل پیش کی جاتی ہے تو ہندی کے حامی مستقبل کی طرف

دیکھتے ہیں۔ وہ امید ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دن حالات بہتر ہوں گے۔ حکومت کی سرپرستی اور عوام کی کوششوں سے ہندی کو اپنی کمیاں پوری کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ یہ سب کچھ صحیح ہو سکتا ہے اور ایسا ہے بھی۔ لیکن یہ دلیل ان لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتی جن کی زبان ہندی سے معیار میں بلند ہے یا کم از کم ہندی کی طرح اس میں کمیاں نہیں ہیں۔

ادبی ترقی اور لغات کی برتری کا سوال تو ذرا نا قابل فہم معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ مناسب تو ہندی پریس کا دوسری علاقائی زبانوں کے پریس کے ساتھ موازنہ کرنا ہوگا۔ اعداد و شمار یا وسعت میں ہندی پریس برتر ہو سکتا ہے مگر جہاں تک نفاست و خوبصورتی یا معیار کا تعلق ہے تامل۔ ملیالم۔ بنگالی۔ مراٹھی پریس یہاں تک کہ گجراتی پریس بھی ہندی سے کئی گنا بہتر ہیں۔ چاہے روزنامے ہوں یا ہفت روزہ یا ماہنامے۔ متذکرہ بالا زبانوں کے پریس کا ہندی کے ساتھ ہر طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ امر کوئی باعث تعجب ہے کہ دوسری علاقائی زبانوں کے ایڈیٹر اور صحافی آل انڈیا نیوز پیپرس ایڈیٹرس کانفرنس اور اس کی متعلقہ تنظیموں میں ہندی والوں سے کہیں زیادہ ممتاز اور نمایاں رول ادا کر رہے ہیں۔

جب یہ بات ظاہر ہے کہ ہندی نے ایک ذریعہ تعلیم۔ یا اظہار ادب۔ یا سرکاری زبان کی حیثیت سے کوئی اچھا اثر قائم نہیں کیا ہے۔ تب علاقائی زبان کے حامیوں کا یہ محسوس کرنا غیر فطری نہیں کہ ان کو بیجا اور ناجائز طور پر (ہندی پڑھوا کر) بوجھ اٹھانے کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے۔ ہندی زبان کی صلاحیت اور اس کی سست رفتار ترقی کے بارے میں شکوک سے ان کو اور زیادہ یقین ہو جاتا ہے کہ ان کی اپنی زبان کہیں زیادہ قابل قدر اور عظیم ہے۔

یہ ممکن ہو سکتا تھا اور شاید یہ آج بھی ممکن ہے کہ ہندی علاقوں میں علاقائی زبانوں کو جاری کر کے ان کے شکوک و شبہات کو دور کیا جا سکا اور انہیں ہندی کے تئیں ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے پر

راغب کیا جا سکے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہندی زبان و ادب کو تنظیم اور منصوبہ کے ساتھ اس طرح ترقی دی جائے کہ علاقائی زبان کے نمائندوں کو بھی اس معاملہ میں اظہار خیال کا موقع ہو۔ ۱۹۴۹ء میں دستور ہند کا ہندی ترجمہ تیار کرتے وقت قطعی اس طرح کی پالیسی اپنائی گئی تھی۔ اگر ہندی کی نشو ونما اور ترقی کے بارے میں اس طرح مشترکہ اور باہمی مذاکرات کئے جاتے تو آج ہندی علاقائی زبانوں سے اونچے اٹھ جاتی اور ہندوستانی زبانوں میں اس کی حیثیت "رانیوں میں پٹ رانی" کی سی ہو جاتی۔ یہ قابل افسوس امر ہے کہ یہ پالیسی اختیار نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس یہ تاثر اپنی جڑیں مضبوط کر رہا ہے کہ ہماری قومی زبان صرف ہندی علاقوں کی ہی زبان ہے یہاں تک کہ ممبران پارلیمنٹ اور تاریخی اور ثقافتی عناصر کی دلیلیں جنہوں نے ۱۹۴۹ء میں باہمی اور متفقہ طور پر ہندی کی حمایت کی تھی۔ اب انہیں دلیلوں اور عناصر کو علاقائی زبانوں کے حامی بلاشبہ جنکی تعداد ہندی بولنے والوں سے زیادہ ہے ہندی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔

اس الجھن سے نکلنے کا کیا راستہ ہے؟ میری رائے میں صرف دو ہی طریقے ہیں جنکو اپنا کر اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے — ایک جذباتی اور دوسرا عملی۔ جذباتی ضرورت صرف اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب علاقائی زبانیں ہندی علاقوں کے اسکولوں کے نصاب کا ایک نہ علیحدہ ہونے والا جز بنا دی جائیں۔ اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی قطعی ذمہ داری ہندی بولنے والوں اور ان کی صوبائی حکومتوں پر ہے۔

یہ نظریہ بذاتہ ہمیں دوسرے حل کی طرف لے جاتا ہے۔ یعنی عملی راستہ کی طرف۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کا مختلف لسانی علاقوں میں پڑھنا پڑھانا اس وقت تک قطعی ناقابل عمل رہے گا جب تک ان سب زبانوں کا ایک ہی رسم الخط نہیں ہو جاتا۔ یہ رسم الخط ہندی ہو یا رومن یہ امر ثانوی ہے۔ اصل میں اہمیت اس بات کی ہے کہ اس مقصد کے لئے ایک مشترکہ رسم الخط ہونا

چاہئے، جبتک یہ نہیں کیا جائے گا زبان کے مسئلہ کو حل کرنے کی تمام کوششیں رائگاں ہو جائیں گی۔
تمام علاقوں میں الگ الگ زبانوں کو مختلف رسم الخطوں میں پڑھانا ایسا ہی الجھن کا باعث ہے
جیسے کسی فٹ بال میچ میں دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں کی پوشاک الگ الگ ہو۔ اور کھلاڑی
کو اپنی ٹیم کے کھلاڑی اور حریف کے کھلاڑی میں کوئی تمیز ہی نہ ہو یہ پیش گوئی کرنے کے لئے کسی
پیغمبر کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ملک کا لسانی جھگڑا اور زیادہ پیچیدہ ہوتا جائے گا جب تک
ایک دن کوئی رہنما حالات سے بلند تر ہو کر تمام ہندوستانی زبانوں کے لئے ایک مشترکہ
رسم الخط کے استعمال کا بندوبست نہیں کر دے گا۔

●●